دھلی کے مشائخ کی ادبی خدمات

مصنفہ:
بیگم ریحانہ فاروقی

اردو اکادمی
دہلی

[illegible]

دہلی کے مشائخ

کی

ادبی خدمات

مصنفہ

بیگم ریحانہ فاروقی

اردو اکادمی، دہلی

حرفِ آغاز

اردو اکادمی، دہلی کی تحقیقی و اشاعتی کمیٹی نے فیصلہ کیا ہے کہ دہلی کی تہذیبی، ادبی اور سماجی زندگی پر مختلف حضرات سے مسودات تیار کرائے جائیں کیونکہ عرصہ سے اس طرح کی کتب کی ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ اس سلسلہ کی ایک کڑی پیشِ نظر کتاب ہے۔

ہم محترمہ بیگم ریحانہ فاروقی صاحبہ کے ممنون ہیں کہ انھوں نے ہماری درخواست پر یہ بیش بہا تحفہ عنایت فرمایا۔

اکادمی کی کوشش ہوگی کہ آئندہ بھی اس طرح کی کتب قارئین کے لیے پیش کرتی رہے۔

سیّد شریف الحسن نقوی
سکریٹری

121124

سلسلۂ مطبوعاتِ اُردو اکادمی ۲۸

891.439
R 305D
1988

تحقیقی و اشاعتی کمیٹی کے اراکین :

ڈاکٹر خلیق انجم (چیرمین)
حکیم عبد الحمید
خواجہ حسن ثانی نظامی
بیگم ریحانہ فاروقی
سیّد شریف الحسن نقوی (سکریٹری)

DEHLI KAY MASHAIKH KI ADABI KHIDMAAT
WRITER : BEGUM REHANA FAROOQUI
1988 Price Rs. 21/-

Lahore University of Management
Sciences Library, DHA Lahore
121124 Date 10.09.06

سنہ اشاعت: فروری ۱۹۸۸ء
قیمت : ۲۱ روپے
بہ اہتمام : ڈاکٹر انتظار مرزا
طباعت : ثمر آفسٹ پرنٹرز، دہلی
ناشر و تقسیم کار: اُردو اکادمی، دہلی۔ گھٹا مسجد روڈ دریا گنج، نئی دہلی ۲۔
ISBN 81—7121—027—9

فہرست

حرفِ آغاز — سید شریف الحسن نقوی — ۷

پیش لفظ — خلیق انجم — ۹

ابتدائیہ — بیگم ریحانہ فاروقی — ۲۰

۱ محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ — ۲۴

۲ طوطی ہند سلطان الشعرا حضرت امیر خسروؒ — ۲۸

۳ حضرت شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ — ۳۷

۴ حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ — ۴۱

۵ حضرت خواجہ میر دردؒ — ۴۴

۶ حضرت خواجہ میر اثر دہلویؒ — ۵۲

۷ حضرت خواجہ محمد نصیر دہلویؒ — ۵۵

۸ مرزا مظہر جانِ جاناںؒ — ۵۷

۹ حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ — ۶۳

۱۰ حضرت مفتی صدرالدین آزردہ دہلویؒ — ۶۵

۱۱ حضرت شاہ ابوالخیر عبداللہ محی الدین خیر فاروقی مجددی دہلویؒ — ۶۸

۱۲ مصوّرِ فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی دہلویؒ — ۷۲

۱۳ الحاج حافظ سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ — ۸۱

پیش لفظ

یہ حقیقت ہے کہ تصوّف کو فروغ مسلمانوں کے ہاتھوں ہوا لیکن اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بقول پروفیسر محمد حبیب مرحوم تصوّف اسلام سے کئی سو برس پہلے انسانی فکر میں آچکا تھا۔ دارا شکوہ کا خیال صحیح ہے کہ تصوّف کی اولین مستند تشریح اپنشدوں میں ملتی ہے۔ غور کیا جائے تو یہ حقیقت بھی واضح ہو جائے گی کہ ترکوں اور منگولوں کا نظریۂ ”ال تنگری“ چینیوں کا تصور ’تیان‘ اور صوفیائے اسلام کا ’نظریۂ حق‘ اساسی طور پر ایک چیز ہیں۔“ (تاریخ مشائخ چشت، طبع دوم، ص ۲۹) میں نے یہ پیش لفظ لکھنے میں ”تاریخ مشائخ چشت“ سے بہت زیادہ استفادہ کیا ہے)۔

قرآن اور آنحضرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی بنیادی تعلیمات میں یہ بھی شامل تھا کہ ہم کسی بے گناہ پر ظلم نہ کریں اور کسی کے ساتھ بے انصافی نہ کریں۔ سماج کے دوسرے افراد کی تو خیر بات ہی کیا، آنحضرتؐ نے غلاموں کے ساتھ بھی مساویانہ اور منصفانہ رویے کی تعلیم دی ہے۔ زندگی کے آخری حج کے موقع پر آنحضرتؐ نے جو تقریر کی تھی، اُس میں ارشاد فرمایا تھا ”غلاموں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔ جو خود کھاؤ، وہی اُن کو کھلانا اور جو خود پہنو وہی اُن کو پہنانا۔ اُن سے کوئی خطا ہو تو درگزر کرنا یا ان کو جدا کر دینا وہ بھی اللہ کے بندے ہیں۔ اُن پر سختی روا نہ رکھنا۔“ آنحضرت کی وفات کے بعد

خلفائے راشدین اسی تعلیم پر عمل فرما رہے۔ لیکن حضرت علیؓ کے بعد بنی اُمیہ نے سیاسی اقتدار حاصل کیا تو انھوں نے ایک ایسا سیاسی نظام قائم کیا جو قرآن اور سنت سے بہت مختلف تھا۔ خلفائے راشدین کے عہد میں سیاسی نظام کی بنیاد عوام کے فلاح وبہبود پر تھی۔ اس نظام کے تحت بڑے چھوٹے، امیر و غریب آزاد اور غلام اور عربی اور عجمی میں کوئی فرق نہیں تھا۔ حکومت اور قانون کی نظر میں سب برابر تھے۔ بنی اُمیہ کے عہد میں اُس انداز کا سیاسی نظام قائم ہوا، جس کی اسلام نے سختی سے مخالفت کی تھی۔ ایک ایسا نظام وجود میں آیا، جس کی بنیاد صرف حکمران طبقے کے مفاد پر تھی۔ پہلے مذہب اور سیاست ایک ہی تھے۔ خلفائے راشدین سیاست کے ساتھ دین کے بھی رہنما ہوتے تھے۔ اب ان دونوں کو علاحدہ کر دیا گیا حکومت نے دین کی سرپرستی اور دینی رہنمائی سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور حکومت صرف سیاست، طاقت اور اقتدار کا نام رہ گیا۔ مذہب کو حکمران طبقے کے مفاد کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو بزرگ حکومت کی ملازمت اور دین کی خدمت میں کوئی فرق نہیں سمجھتے تھے انھوں نے حکومت سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ بنی اُمیہ ہی کے عہد میں ایسے دردناک واقعات ہوئے جو انسانیت پر بدنما ترین داغ بن گئے اور جس نے ایک ایسا تفرقہ پیدا کر دیا جو آج تک ملت اسلامیہ کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے خواجہ فریدالدین عطارؒ کے تذکرۃ الاولیا کے حوالے سے صوفیا کو کئی طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ اُن کے قول کے مطابق پہلے طبقے کا زمانہ ۶۶۱ھ سے ۸۵۰ھ تک ہے، اس طبقے کے اہم صوفیائے کرام ہیں حضرت اویس قرنیؒ، حضرت حسن بصریؒ، حضرت مالک دینارؒ، حضرت محمد واسعؒ، حضرت حبیب عجمیؒ، حضرت خواجہ فضیل بن عیاض اور حضرت ابراہیم ادہم وغیرہ۔

کوفے کا گورنر یزید چاہتا تھا کہ امام ابو حنیفہؒ کی خدمات سے فائدہ اٹھائے، اس نے امام اعظم کو میر منشی اور افسر خزانہ کا عہدہ پیش کیا لیکن انھوں نے قبول نہیں کیا۔ یزید نے بہت اصرار کیا لیکن آپ کسی قیمت پر نہیں مانے۔ امام اعظم کے اس انکار سے یزید کو اپنی بے عزتی محسوس ہوئی۔ اس نے حکم دیا کہ ہر روز امام صاحب کے دس کوڑے لگائے

جائیں۔ کوڑوں کی تکلیف برداشت کرتے رہے، لیکن امام ابو حنیفہؒ نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا۔ یزید کے بعد خلیفہ منصور نے قضا کا عہدہ پیش کیا۔ آپ نے اس سے بھی انکار کردیا۔ منصور کو اس انکار پر اتنا غصہ آیا کہ اس نے امام صاحب کو قید خانے میں ڈال دیا، جہاں اُن کا انتقال ہوگیا۔

صوفیا کے دوسرے طبقے میں حضرت بایزید بسطامیؒ، حضرت ذوالنون مصریؒ، حضرت جنید بغدادیؒ وغیرہ شامل ہیں، یہ حضرات اس زمانے میں پیدا ہوئے جب مسلمانوں میں یونان اور دوسرے ممالک کے علوم اور فلسفے مقبولیت حاصل کرچکے تھے۔ ان فلسفوں اور علوم نے مسلمانوں میں عقلیت کو فروغ دے کر اُن سے عقیدے کی پختگی چھین لی۔ شک نے عقیدوں میں رخنے ڈال دیے۔ اس کی وجہ سے اسلام کے مذہبی نظام کو سخت نقصان پہنچا۔ اس عہد کے صوفیا نے ”عشق الٰہی“ سے اس طوفان کا مقابلہ کیا۔ دماغ سے زیادہ دل پر اور منطق سے زیادہ عقیدے پر زور دیا۔

صوفیہ کا تیسرا طبقہ جو دسویں صدی عیسوی میں پیدا ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب علما اور صوفیا کا بہت بڑا طبقہ اسلام کی اصل روح سے ہٹ کر فقہی مسائل میں الجھ گیا اس عہد میں کتاب و سنت کی حالت پر مولانا ابوالکلام آزاد نے بہت بصیرت افروز تبصرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ”کتابُ و سنّت کی تقدیم و حفظ کا بند تو پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا اور بنیاد فقاہت محض اٹکل اور ظن و وہم پر قرار پا چکی تھی پھر کیا تھا؟ ہر ذہن نے تیزی دکھائی اور ہر قیاس نے بلند پروازی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شریعتِ الٰہی جو عدل و صداقت کے قیام کے لیے آئی تھی اُسی کے نام سے مکر و فریب اور ظلم و غضب و نہب و صلب کے تمام کاروبار جاری ہوگئے، اور دنیا کی تباہی کے لیے اس سے بدتر وقت اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ خدا کا پاک نام لے کر اس کی دنیا میں برائی پھیلائی جائے، کتنی ہی زناکاریاں ہیں جو حیلے نکال کر نکاح شرعی بنائی گئیں! کتنے ہی غضب و ظلم اور اکل اموال بالباطل کے مصائب ہیں جن کو

> ایک شرعی معاملہ بنا کر جائز کیا گیا! کتنے ہی عقودِ فاسدہ ہیں جن کو اسی شیطانِ جبل نے جائز کرا کے بندگانِ الٰہی کے حقوق تلف کرائے! کتنے ہی حج ہیں جو ساقط ہوئے، کتنی ہی ذکاتیں ہیں جو کبھی ادا نہیں کی گئیں! کتنے ہی شارب الخمر اور زانی محض ہیں جو حدودِ شرعیہ سے صاف بچا لیے گئے۔" (تذکرہ مولانا ابوالکلام آزاد بحوالہ تاریخِ مشائخ چشت، ص ۸۹)۔

ان مذہبی فتنہ پردازیوں نے اسلام کے اخلاقی نظام کو سخت نقصان پہنچایا۔ اب اصلاحِ باطن کی طرف توجہ نہیں رہی۔ مذہب کی اصل روح کو یکسر فراموش کر دیا گیا۔ اس عہد میں جن صوفیائے کرام نے اس اخلاقی بحران کے گھور اندھیروں میں روشنی کے میناروں کا کام کیا اُن کے اسمائے گرامی ہیں۔ شیخ ابوسعید ابن العربیؒ، شیخ ابومحمد الخلدیؒ، شیخ ابونصر السراجؒ، شیخ ابوطالب مکیؒ، شیخ ابوبکرؒ اور ابوعبدالرحمٰن السلمی وغیرہ۔

بارہویں صدی تک پہنچتے پہنچتے تصوّف نے ایک باقاعدہ فن کی حیثیت اختیار کر لی۔ تصوّف پر کئی اہم کتابیں لکھی جا چکی تھیں۔ صوفیا کے تذکرے مرتب ہو چکے تھے۔

یوں تو تصوّف کے اتنے سلسلے ہیں کہ اُن کی گنتی کرنا دشوار ہے لیکن ہندوستان کے سیاق و سباق میں شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کا سلسلہ قادریہ۔ شیخ ابو اسحٰقؒ کا سلسلہ چشتیہ۔ شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کا سلسلہ سہروردیہ اہم ہیں ایسے سلسلے بھی ہیں، جو ہندوستان ہی میں قائم ہوئے۔

ہندوستان میں تصوّف کی باقاعدہ داغ بیل چشتیہ سلسلے کے بزرگ خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ہاتھوں پڑی۔ جو پرتھوی راج کے عہد میں ہندوستان آئے تھے۔ اگرچہ خواجہ صاحب سے پہلے بھی ہندوستان میں بہت سے بزرگ آئے تھے مگر تاریخ میں اُن کے حالات پوری طرح روشن نہیں ہیں۔ خواجہ صاحب نے ہندوستان آ کر اجمیر میں قیام کیا، جہاں تمام عمر رشد و ہدایت کا کام کرتے رہے۔ تصوّف کے ایک اور مشہور سلسلے سہروردیہ کے ایک بزرگ حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا بھی ہندوستان آئے اور انھوں نے ملتان و سندھ کو مرکز بنایا۔ اس زمانے میں ایک اور سلسلہ "فردوسیہ

سلسلہ“ ہندوستان میں قائم ہوا۔ جیسے حضرت شیخ بدرالدین سمرقندی نے ہندوستان میں جاری کیا۔ پندرھویں صدی کے وسط تک شاہ نعمت اللہ قادری۔ قادری سلسلے کے اور شاہ عبداللہ شطاری شطاریہ سلسلے کے بزرگ بھی ہندوستان آچکے تھے۔

اکبر کے عہد میں خواجہ باقی باللہ نے ہندوستان میں نقشبندیہ سلسلہ قائم کیا۔ یہی چند بڑے بڑے سلسلے ہیں جنھوں نے پندرھویں صدی عیسوی سے لے کر انیسویں صدی کے آخر تک تمام اقطاع ہند میں خانقاہی نظام کو منضبط اور منظم کر کے چلایا اور اپنے حلقۂ اثر میں اصلاح کی۔ آج بھی ہندوستان کی تمام معروف اور لائقِ ذکر خانقاہوں کا سلسلہ انہی سے ملتا ہے۔

ہندوستان میں تصوف صحت مند اور توانا اقدار لے کر آیا تھا۔ جس نے ایک عظیم تحریک کی صورت اختیار کر لی تھی۔ صوفیا ایک طرف حکمران طبقے کے ظلم واستبداد کے خلاف جہاد کرتے تھے اور دوسری طرف بے بس اور لاچار اور مجبور انسانوں کو صبر و قناعت اور تسلیم و رضا نیز انسانی عظمت اور خودداری کا درس دے کر ان میں خود اعتمادی اور بلند کرداری پیدا کرتے تھے۔ یہ انہی صوفیا کا فیض تھا کہ حکمران طبقہ کی گمراہیوں کے باوصف مذہبی عقائد میں ایسا زوال پیدا نہیں ہوا جو عام لوگوں کو اس سے منحرف کر دیتا یا حالات کا بہاؤ انھیں کسی اور طرف لے جاتا۔ وہ بناوٹ تصنع اور کٹھ ملاؤں کے ظاہری فریب سے بچ کر باطنی تربیت۔ تقویٰ۔ طہارتِ نفس کی تعلیم دینے لگے۔ یہ صوفیا اتباعِ سنتِ نبوی پر زور دیتے اور احترامِ شریعت کو ملحوظ رکھتے تھے حضرت نصیرالدین چراغ دہلی نے ایک بار اپنے مرید کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

”مسلکِ پیر حجت نمی شود۔ دلیل از کتاب و سنت می باید“

ضیاءالدین برنی تاریخ فیروز شاہی میں لکھتا ہے:

”...... شیخ الاسلام نظام الدین دربیعت عام کشادہ بود و گناہ گاران را خرقہ و توبہ میداد و بارادہ خود قبول می کرد و خاصا و عاما و غنیا و مفلسا و

خلفائے راشدین اسی تعلیم پر عمل فرما رہے۔ لیکن حضرت علیؓ کے بعد بنی اُمیّہ نے سیاسی اقتدار حاصل کیا تو انھوں نے ایک ایسا سیاسی نظام قائم کیا جو قرآن اور سنّت سے بہت مختلف تھا۔ خلفاے راشدین کے عہد میں سیاسی نظام کی بنیاد عوام کی فلاح و بہبود پر تھی۔ اس نظام کے تحت بڑے چھوٹے، امیر و غریب آزاد اور غلام اور عربی اور عجمی میں کوئی فرق نہیں تھا۔ حکومت اور قانون کی نظر میں سب برابر تھے۔ بنی اُمیّہ کے عہد میں اُس انداز کا سیاسی نظام قائم ہوا، جس کی اسلام نے سختی سے مخالفت کی تھی۔ ایک ایسا نظام وجود میں آیا، جس کی بنیاد صرف حکمران طبقے کے مفاد پر تھی۔ پہلے مذہب اور سیاست ایک ہی تھے، خلفاے راشدین سیاست کے ساتھ دین کے بھی رہنما ہوتے تھے۔ اب ان دونوں کو علاحدہ کر دیا گیا حکومت نے دین کی سرپرستی اور دینی رہنمائی سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور حکومت صرف سیاست، طاقت اور اقتدار کا نام رہ گیا۔ مذہب کو حکمران طبقے کے مفاد کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جو بزرگ حکومت کی ملازمت اور دین کی خدمت میں کوئی فرق نہیں سمجھتے تھے، انھوں نے حکومت سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ بنی اُمیّہ ہی کے عہد میں ایسے دردناک واقعات ہوئے جو انسانیت پر بدنما ترین داغ بن گئے اور جس نے ایک ایسا تفرقہ پیدا کر دیا جو آج تک ملّت اسلامیہ کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے خواجہ فریدالدین عطارؒ کے تذکرۃ الاولیا کے حوالے سے صوفیا کو کئی طبقوں میں تقسیم کیا ہے۔ اُن کے قول کے مطابق پہلے طبقے کا زمانہ ۶۶۱ھ سے ۸۵۰ھ تک ہے، اس طبقے کے اہم صوفیاے کرام ہیں حضرت اویس قرنیؒ۔ حضرت حسن بصریؒ، حضرت مالک دینارؒ، حضرت محمد واسعؒ، حضرت حبیب عجمیؒ، حضرت خواجہ فضیل بن عیاض اور حضرت ابراہیم ادہم وغیرہ۔

کوفے کا گورنر یزید چاہتا تھا کہ امام ابو حنیفہؒ کی خدمات سے فائدہ اٹھائے، اس نے امام اعظم کو میر منشی اور افسر خزانہ کا عہدہ پیش کیا لیکن انھوں نے قبول نہیں کیا۔ یزید نے بہت اصرار کیا لیکن آپ کسی قیمت پر نہیں مانے۔ امام اعظم کے اس انکار سے یزید کو اپنی بے عزتی محسوس ہوئی۔ اس نے حکم دیا کہ ہر روز امام صاحب کے دس کوڑے لگائے

جائیں۔ کوڑوں کی تکلیف برداشت کرتے رہے، لیکن امام ابو حنیفہؒ نے اپنا فیصلہ نہیں بدلا۔ یزید کے بعد خلیفہ منصور نے قضا کا عہدہ پیش کیا۔ آپ نے اس سے بھی انکار کردیا۔ منصور کو اس انکار پر اتنا غصّہ آیا کہ اس نے امام صاحب کو قید خانے میں ڈال دیا، جہاں اُن کا انتقال ہوگیا۔

صوفیا کے دوسرے طبقے میں حضرت بایزید بسطامیؒ، حضرت ذوالنون مصریؒ، حضرت جنید بغدادیؒ وغیرہ شامل ہیں، یہ حضرات اس زمانے میں پیدا ہوئے جب مسلمانوں میں یونان اور دوسرے ممالک کے علوم اور فلسفے مقبولیت حاصل کرچکے تھے۔ ان فلسفوں اور علوم نے مسلمانوں میں عقلیت کو فروغ دے کر اُن سے عقیدے کی پختگی چھین لی۔ شک نے عقیدوں میں رخنے ڈال دیے۔ اس کی وجہ سے اسلام کے مذہبی نظام کو سخت نقصان پہنچا۔ اس عہد کے صوفیا نے "عشقِ الٰہی" سے اس طوفان کا مقابلہ کیا۔ دماغ سے زیادہ دل پر اور منطق سے زیادہ عقیدے پر زور دیا۔

صوفیہ کا تیسرا طبقہ جو دسویں صدی عیسوی میں پیدا ہوا۔ یہ وہ زمانہ ہے جب علما اور صوفیا کا بہت بڑا طبقہ اسلام کی اصل روح سے ہٹ کر فقہی مسائل میں الجھ گیا اس عہد میں کتاب و سنت کی حالت پر مولانا ابوالکلام آزاد نے بہت بصیرت افروز تبصرہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "کتابُ و سنّت کی تقدیم وحفظ کا بند تو پہلے ہی ٹوٹ چکا تھا اور بنیاد فقاہت محض اٹکل اور ظن و وہم پر قرار پا چکی تھی پھر کیا تھا؟ ہر ذہن نے تیزی دکھائی اور ہر قیاس نے بلند پروازی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ شریعتِ الٰہی جو عدل و صداقت کے قیام کے لیے آئی تھی اُسی کے نام سے مکر و فریب اور ظلم و غضب و نہب و صلب کے تمام کاروبار جاری ہو گئے، اور دنیا کی تباہی کے لیے اس سے بدتر وقت اور کوئی نہیں ہو سکتا کہ خدا کا پاک نام لے کر اس کی دنیا میں برائی پھیلائی جائے، کتنی ہی زناکاریاں ہیں جو حیلے نکال کر نکاح شرعی بنائی گئیں! کتنے ہی غضب و ظلم اور اکل اموال بالباطل کے مصائب ہیں جن کو

ایک شرعی معاملہ بنا کر جائز کیا گیا! کتنے ہی عقودِ فاسدہ ہیں جن کو اسی شیطانِ حیل نے جائز کرا کے بندگانِ الٰہی کے حقوق تلف کرائے! کتنے ہی حج ہیں جو ساقط ہوئے، کتنی ہی ذکاتیں ہیں جو کبھی ادا نہیں کی گئیں! کتنے ہی شارب الخمر اور زانی محض ہیں جو حدودِ شرعیہ سے صاف بچا لیے گئے۔" (تذکرہ مولانا ابوالکلام آزاد بحوالہ تاریخِ مشائخ چشت، ص ۸۹)۔

ان مذہبی فتنہ پردازیوں نے اسلام کے اخلاقی نظام کو سخت نقصان پہنچایا۔ اب اصلاحِ باطن کی طرف توجہ نہیں رہی۔ مذہب کی اصل روح کو یکسر فراموش کر دیا گیا۔ اس عہد میں جن صوفیائے کرام نے اس اخلاقی بحران کے گھور اندھیروں میں روشنی کے میناروں کا کام کیا اُن کے اسمائے گرامی ہیں: شیخ ابوسعید ابن العربیؒ، شیخ ابومحمد الخلدیؒ، شیخ ابونصر السراجؒ، شیخ ابوطالب مکیؒ، شیخ ابوبکرؒ اور ابوعبدالرحمٰن السلمی وغیرہ۔

بارہویں صدی تک پہنچتے پہنچتے تصوّف نے ایک باقاعدہ فن کی حیثیت اختیار کر لی۔ تصوّف پر کئی اہم کتابیں لکھی جا چکی تھیں۔ صوفیا کے تذکرے مرتب ہو چکے تھے۔

یوں تو تصوّف کے اتنے سلسلے ہیں کہ اُن کی گنتی کرنا دشوار ہے لیکن ہندوستان کے سیاق و سباق میں شیخ محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کا سلسلہ قادریہ۔ شیخ ابواسحٰقؒ کا سلسلۂ چشتیہ۔ شیخ شہاب الدین سُہروردیؒ کا سلسلہ سُہروردیہ اہم ہیں ایسے سلسلے بھی ہیں، جو ہندوستان ہی میں قائم ہوئے۔

ہندوستان میں تصوّف کی باقاعدہ داغ بیل چشتیہ سلسلے کے بزرگ خواجہ معین الدین چشتیؒ کے ہاتھوں پڑی۔ جو پرتھوی راج کے عہد میں ہندوستان آئے تھے۔ اگرچہ خواجہ صاحب سے پہلے بھی ہندوستان میں بہت سے بزرگ آئے تھے مگر تاریخ میں اُن کے حالات پوری طرح روشن نہیں ہیں۔ خواجہ صاحب نے ہندوستان آ کر اجمیر میں قیام کیا، جہاں تمام عمر رشد و ہدایت کا کام کرتے رہے۔ تصوّف کے ایک اور مشہور سلسلے سُہروردیہ کے ایک بزرگ حضرت شیخ بہاؤالدین زکریا بھی ہندوستان آئے اور انھوں نے ملتان و سندھ کو مرکز بنایا۔ اس زمانے میں ایک اور سلسلہ "فردوسیہ

سلسلہ" ہندوستان میں قائم ہوا۔ جیسے حضرت شیخ بدرالدین سمرقندی نے ہندوستان میں جاری کیا۔ پندرھویں صدی کے وسط تک شاہ نعمت اللہ قادری۔ قادری سلسلے کے اور شاہ عبداللہ شطاری شطاریہ سلسلے کے بزرگ بھی ہندوستان آچکے تھے۔

اکبر کے عہد میں خواجہ باقی باللہ نے ہندوستان میں نقشبندیہ سلسلہ قائم کیا۔ یہی چند بڑے بڑے سلسلے ہیں جنھوں نے پندرھویں صدی عیسوی سے لے کر انیسویں صدی کے آخر تک تمام اقطاع ہند میں خانقاہی نظام کو منضبط اور منظم کرکے چلایا اور اپنے حلقۂ اثر میں اصلاح کی۔ آج بھی ہندوستان کی تمام معروف اور لائقِ ذکر خانقاہوں کا سلسلہ انھی سے ملتا ہے۔

ہندوستان میں تصوّف صحت مند اور توانا اقدار لے کر آیا تھا۔ جس نے ایک عظیم تحریک کی صورت اختیار کرلی تھی۔ صوفیا ایک طرف حکمراں طبقے کے ظلم واستبداد کے خلاف جہاد کرتے تھے اور دوسری طرف بے بس اور لاچار اور مجبور انسانوں کو صبر و قناعت اور تسلیم و رضا نیز انسانی عظمت اور خودداری کا درس دے کر ان میں خود اعتمادی اور بلند کرداری پیدا کرتے تھے۔ یہ انھی صوفیا کا فیض تھا کہ حکمراں طبقہ کی گمراہیوں کے باوصف مذہبی عقائد میں ایسا زوال پیدا نہیں ہوا جو عام لوگوں کو اس سے منحرف کردیتا یا حالات کا بھاؤ انھیں کسی اور طرف لے جاتا۔ وہ بناوٹ تصنع اور کٹھ ملاؤں کے ظاہری فریب سے بچ کر باطنی تربیت۔ تقویٰ۔ طہارتِ نفس کی تعلیم دینے لگے۔ یہ صوفیا اتباع سنتِ نبوی پر زور دیتے اور احترام شریعت کو ملحوظ رکھتے تھے حضرت نصیر الدین چراغ دہلی نے ایک بار اپنے مرید کو تنبیہ کرتے ہوئے فرمایا:

"مسلکِ پیر حجت نمی شود۔ دلیل از کتاب و سنّت می باید"

ضیاءالدین برنی تاریخ فیروز شاہی میں لکھتا ہے:

"..... شیخ الاسلام نظام الدین در بیعت عام کشادہ بود و گناہ گاران را خرقہ و توبہ میداد و بارادہ خود قبول می کرد و خاصا و عاما و غنیا و مفلسا و

> ملکا و فقیرا و متعلما و جاہلا و شریفا و صوفیا و مصریا و رستاقیا و غازیا و مجاہدا و احرارا و عبیدا طاقیہ و توبہ و مسواک پالی میفرمود و جماہیر طوائفہ مذکور از آں کہ خود را مرید شیخ میدانستند از بسیار ناکردہ و ینہا دست می داشتند۔ ۔ ۔ ۔ مرد و زن و پیر و جوان و بازاری و عامی غلام و چاکر کودکان و خورد سال بہ نماز در آمدہ بودند۔ و اغلب و اکثر در آیندگان ارادت نماز چاشت و اشراق را ملازم گشتہ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ و کار مریدان قدیم جزئ طاعت و عبادات و ترک و تجوید و کتب سلوک خواندن و مآثر مشائخ و معاملات مشائخ و حکایت کردن کارے دیگر نمود۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ خواص و عوام نیکو کاری و گرائیدہ و حاشا و کلآ در چند سال آخر عہد علائی نام شراب و شاہد و فسق و فجور و قمار و فحش و لواطت و بچہ بازی بر زبان اکثر مردمان گذشتہ باشد“[1]

ظاہر ہے کہ تصوف مردم بیزار نہیں تھا۔ اس میں انسان دوستی۔ زندگی کی قدروں پر ایمان۔ سچائی اور صداقت تھی۔ یہ سماجی اصلاح کی بہترین تحریک تھا۔ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ یہ حضرات رہبانیت کے قائل تھے۔ یا انھوں نے عوام کو ترکِ دنیا کی تعلیم دی۔ ان کا مقصدِ اصلاح یہ تھا کہ اخلاق کی تربیت کی جائے۔ اکل حلال حاصل کیا جائے۔ اور لذاتِ دنیا سے کنارہ کش ہو کر کتاب و سنت کی پیروی میں ثابت قدم رہا جائے۔ یہ دنیا میں بہتر زندگی گزارنے کے وسائل تھے ترکِ دنیا کے نہیں۔

چناں چہ حضرت نظام الدین اولیا کہا کرتے تھے:

> ”ترک دنیا آں نیست کہ کسے خود را برہنہ کند لنگوتہ بہ بندد و بنشیند۔ ترک دنیا آں ست کہ لباس بہ پوشد و طعام بہ خورد و اما آنچہ میرسد روا بدارد و بہ جمع او میل نہ کند و خاطر را متعلق چیزے نہ آورد۔ ترکِ دنیا است“[2]

---

[1] تاریخ فیروز شاہی۔ ص/ ۳۴۳-۳۴۶ [2] فوائد الفواد۔ ص/ ۹

حضرت گیسو دراز اپنے مریدوں کو تعلیم دیتے تھے:

> ” دوستوں کی ضیافت فقیروں کو کھانا کھلانے سے بہتر ہے۔ ہاں اگر کوئی صلۂ رحمی ہو تو اس کا حصہ مقدم رکھنا چاہیئے۔“[1]

حضرت گیسو دراز نے کبھی اپنے مریدوں کو ترک دنیا کی تعلیم نہیں دی۔ دکن میں اُن کے کچھ مرید شاہی ملازمت میں تھے۔ حضرت گیسو دراز اپنے دو مریدوں ملک عزیز الدین اور ملک شہاب الدین کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

> ” ...... در ہر کارے کہ ہستی باش۔ باید کہ با خدا باش و بہ طلب مقصود خود باش۔ گفتہ اند۔ بیت
>
> مراد اہل طریقت لباس ظاہر نیست
> کمر بخدمت سلطان بہ بند و صوفی باش
>
> ترا کہ چاکری سلطان و خدمت پدر ادائے حقوق متعلقان زبان کار نباشد۔ تو با خدا و پیر متوجہ باشد ہرچہ بکنی بکنی مگر خلافِ شرع نہ کنی۔“[2]

تصوّف کو ہندوستان آئے ہوئے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا کہ بعض نااہل لوگوں کی بے اعتدالیوں نے انفرادیت کو فروغ دینا شروع کر دیا۔ مجہولیت دنیا کی بے ثباتی کا شدید احساس۔ بے وجہ قناعت اور کلبیت و انفعالیت نے تصوّف میں راہ پائی۔ تصوّف جس کا مقصد انسان دوستی تھا۔ مردم بیزار ہوگیا۔ قرآن، شرع۔ رسومات مذہب اور سنّت نبوی کو بے کار سمجھ کر وحدت الوجود کے فلسفے پر زور دیا جانے لگا۔ اس طرح اسلام اور اسلامی تصوّف کی صورت مسخ ہونے لگی۔ اور یہ شاید اکبر کے زمانے میں انتہا کو پہنچ گئی۔

اکبر کی تحریک ” دینِ الٰہی“ اور مجدد الف ثانیؒ کی تحریک ” اتباعِ سنّت“ تقریباً

---

[1] خاتمہ شریف۔ ص/ ۴

[2] مکتوبات گیسو دراز۔ ص/ ۹۸

ایک مخصوص حالات کے دو مختلف ردّعمل ہیں۔ اگر ہم اکبر کے دور کے علما اور صوفیا کے حالات پر نظر ڈالیں تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ اکبر نے "دین الٰہی" کیوں ایجاد کیا تھا۔ اور احیاے سنّت کے لیے مجدد الف ثانیؒ کیوں پیدا ہوئے۔

ابتدا میں اکبر مذہب اسلام کا بہت زیادہ احترام کرتا تھا۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ سنہ ۱۵۸۵ء میں ابوتراب مکّہ سے ایک پتھر لائے جس پر آنحضرتؐ کا نقش قدم بتایا جاتا تھا۔ اکبر شہر سے چار کوس دور استقبال کے لیے گیا اور حکم دیا کہ تمام امراے دربار باری باری اس پتھر کو لے چلیں۔

مگر بعد میں کچھ علما کی بے دینی۔ عیاری اور مکاری۔ ہوسِ دولت و جاہ دیکھ کر اکبر ان سے متنفّر ہوگیا۔ اس عہد کے علما پر تبصرہ کرتے ہوئے مجدد الف ثانیؒ لکھتے ہیں:

> "عالم در دریاے بدعت غرق گشتہ است و بہ صلمات بدعت آرام گرفتہ۔
> درا مجال است کہ دم از رفع بدعت زند۔ و باحیا سنت لب کشاید۔
> اکثر علما ایں وقت رواج دھندہ ہائے بدعت اند و محوکنند ہائے
> سنّت"۔[1]

مذہبی مسائل میں اکبر علماے دین کا مشورہ طلب کرتا تو ایک عالم ایک چیز جائز قرار دیتا اور دوسرا اس کو حرام۔ اکبر مخدوم الملک سید عبداللہ کی بہت عزت کرتا تھا۔ لیکن اس کی جاہ پرستی۔ دنیاداری اور غیراسلامی حرکتوں نے اکبر کے بنیادی عقائد بدل دیے۔ مخدوم الملک کے بارے میں ملّا عبدالقادر بدایونی لکھتے ہیں:

> "چنداں خزائن و دفائن او پدید گشت۔ قفل آں را بہ کلید وہم نتواں کشاد۔ ازاں جملہ
> چند صندوق طلا را از گورخانہ مخدوم الملک کہ بہ بہانہ اموات دفن کردہ بود ظاہر شد"[2]

---

[1] مکتوبات مجدد الف ثانیؒ۔ جلد دوم۔ ص/ ۱۰۲ ۔

[2] منتخب التواریخ۔ ص/ ۳۱۱ ۔

انھی حالات نے اکبر میں صداقت اور سچائی کی تلاش کا جذبہ پیدا کیا۔ اُس نے ۱۵۷۵ء میں ”عبادت خانہ“ کے نام سے ایک عمارت بنوائی۔ اس کے چار حصے تھے۔ جن میں سید، علما، فقہا، شرفا اور امرا بیٹھتے تھے۔ مذہبی مسائل پر مجادلے اور مباحثے ہوتے۔ اکبر کافی عرصے تک ان سب کی بحث و تکرار سنتا رہا۔ آخر وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ ہر شخص دلائل پیش کرنے کی بجائے جذباتیت۔ شور وغل اور غم و غصہ سے دوسروں کو شکست دینے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ مباحثے صداقت کی طرف رہنمائی کی بجائے ذہنی ورزشیں تھیں۔ خانقاہوں کی حالت دیکھ کر اکبر کو اور بھی مایوسی ہوئی۔ اہل طریقت کو اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں تھا۔ ”ہمہ اوست“ کے فلسفے کا سہارا لے کر اہل خانقاہ مذہب کی ظاہری رسوم۔ پابندی شرع اور اتباع سنت سے بالکل بے نیاز ہو گئے تھے۔ خانقاہیں عیش و عشرت۔ آوارگی اور خلاف مذہب و اخلاق ہندوستانی تہذیب و تمدن سے متاثر ہو کر دربار میں جن غیر اسلامی رسومات کو دخل ہو گیا تھا عالمگیر نے انھیں ختم کر دیا۔ تخت پر بیٹھتے ہی سنِہ شمسی کو جو پارسیوں کی تقلید سے قائم کیا گیا تھا۔ قمری سے بدل دیا۔ ”درشن“ کا طریقہ بالکل بند کر دیا۔ لوگ دربار میں بادشاہ کی تعظیم کے خیال سے ایک دوسرے کو صرف ہاتھ کے اشارے سے سلام کرتے تھے۔ اورنگ زیب نے سلام کا مسنون طریقہ رائج کیا اور حکم دیا کہ مسلمان عام طور پر سلام کا یہی طریقہ برتیں اس نے ایک کام یہ کیا کہ علما و فضلا کو جمع کر کے تصنیف کا ایک محکمہ قائم کیا۔ اور کئی سال کی لگاتار کوششوں کے بعد فتاویٰ عالمگیری تیار کرائی[1] اورنگ زیب سے قبل مغل بادشاہ سکوں پر کلمہ کندہ کرتے تھے۔ اورنگ زیب نے اسے بند کرا دیا۔ تاکہ کلمہ کی بے حرمتی نہ ہو۔ ۱۳ر مئی ۱۶۵۹ء کو تمام صوبہ داروں کو ایک سرکولر بھیجا گیا۔ جس میں سخت ہدایات دیں کہ اُن کے علاقے میں بھنگ وغیرہ کی کاشت نہ کی جائے۔ اور حکم عدولی کرنے والوں کو جائز سزا دی جائے[2]

---

[1] عالمگیر سے متعلق تمام معلومات ”مضامین عالمگیری“ سے لی گئی ہیں۔ ص / ۱۳۵۔۱۳۸

[2] تاریخ اورنگ زیب۔ سرکار۔ جلد سوم۔ ص / ۸۲۔۸۴ ۔

اورنگ زیب نے تمام پرانی مسجدوں کی مرمت کراکے انھیں درست کروایا اوران میں امام، مؤذن اور خطیب اور دوسرے ملازم رکھے۔ جن کی تنخواہیں سرکاری خزانوں سے دی جاتی تھیں۔ لیکن اورنگ زیب کی آنکھ بند ہوتے ہی مجدّد تحریک کا اثر ختم ہونے لگا۔

چوں کہ اس کی وفات کے بعد مغل حکومت کا زوال شروع ہوگیا تھا۔ بادشاہ امرا اور اہلِ سیف لاچار اور مجبور ہوگئے تھے اس لیے وہ اپنے بازوؤں اور تدبیروں سے زیادہ خانقاہوں میں کی جانے والی دعاؤں تعویذوں اور ایسی روحانی چیزوں پر یقین کرتے لگے۔ ہم نے پہلے باب میں اس عہد کے سیاسی اور سماجی حالات پر تفصیلی بحث کی ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب ہندوستانی سیاست میں زوال آنے کی وجہ سے اخلاقی اور مذہبی اقدار بھی زوال پذیر ہوگئی تھیں۔ مذہب ایک مضحکہ خیز چیز بن گئی تھی۔ خانقاہوں میں رہنے والے عیار اور مکار صوفیوں کی پورے سماج پر گرفت بہت مضبوط ہوگئی تھی اور محمد شاہ کا زمانہ تو اس سلسلے میں یادگار ہے۔ اس زمانے کے متعلّق مرزا حیرت لکھتے ہیں:

> ،،(محمد شاہ رنگیلے کا زمانہ) انتہا درجہ کا ملکی اور مذہبی پہلو سے تاریک تر اور ناپاک تھا۔ شریعت محمدؐی پر مضحکہ خیز نکتہ چینیاں عین دربار میں ہوتی تھیں۔ اور مے نوشی کی لذتوں اور سرخوشانہ اور بیخودانہ حالتوں کے آگے حدیث نبوی پر قہقہے اڑائے جاتے تھے۔ ....محمد شاہ بادشاہ کے زمانے میں جس تصوّف نے رنگ جمایا تھا وہ اسلامی توہین کا اپنے میں بڑا مادہ رکھتا تھا۔ امرد پرستی اور ناپاک عشق کا صوفیوں کی مجلسوں میں عروج ہوا۔۔
>
> ..... محمد شاہ کے زمانے میں اس جھوٹے تصوّف اور قابل نفرت صوفیوں کو جس قدر عروج ہوا وہ تاریخ میں ایک نامور زمانہ ہے۔ اکثر عظیم الشان جلسوں میں اللہ ہو کی صدائیں اور جھوٹے صوفیوں

کے چٹخاروں کی آوازیں بلند ہوتی ہوئی سنائی دیتی تھیں۔ اوران میں وہ وہ خرافات باتیں ہوتی تھیں کہ جو قابل بیان نہیں"۔ لہ

ہر طرف انحطاط اور زوال کا بازار گرم تھا۔ بادشاہ اور امرا اور رؤسا سے لے کر عوام تک سب عیش و عشرت میں مبتلا تھے۔ سماج کی شکست و ریخت کے نمایاں آثار دکھائی دے رہے تھے۔ ان حالات پر تفصیلی بحث اور روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ تصوّف محض ایک افیون بن کر رہ گیا تھا۔ جس سے "غرض نشاط" نہیں بلکہ یک گونہ بے خودی تھی۔

اس عہد کو پھر سے ایک مجدد الف ثانیؒ کی ضرورت تھی۔ مگر اس دفعہ ایک نہیں کئی مجدد پیدا ہوئے۔ شاہ ولی اللہؒ مولانا فخر الدینؒ اور خواجہ میر دردؒ۔ ان سب بزرگوں نے پھر مجدد تحریک کا احیا کیا ان سب میں کچھ اختلافات ضرور تھے مگر بنیادی عقائد ایک ہی تھے۔ یعنی قرآن اور سنت نبوی کی تبلیغ"۔

اردو اکادمی دہلی کی اشاعتی و طباعتی کمیٹی کی کوشش رہی ہے کہ کچھ ایسی کتابیں بھی شائع کرے، جن سے دہلی کی سینکڑوں برس کی تہذیبی، مذہبی، سیاسی اور سماجی زندگی کے اہم پہلو روشن ہو سکیں۔ کمیٹی نے اس سلسلے میں بیگم ریحانہ فاروقی سے فرمایش کی کہ وہ ایک ایسی کتاب تحریر فرما دیں، جو مختصر ہو لیکن دہلی کے اہم مشائخ کے سوانح اور اُن کی تعلیمات کا احاطہ کرے تاکہ اپنے اس عظیم ورثے کو عام لوگوں تک پہنچا سکیں۔

بیگم فاروقی کا تعلق حضرت شاہ کلیم الدین کی درگاہ سے ہے اور وہ "آستانہ" جیسے اہم رسالے کی مدیر ہیں، اس لیے انھیں ہندوستانی تصوّف اور دہلی کے صوفیائے کرام سے بھرپور واقفیت ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ انھوں نے بڑے سلیقے اور خوش اسلوبی سے یہ کام انجام دیا ہے۔

خلیق انجم

لہ حیات طیبہ۔ ص/ ۷۔ ۹

ابتدائیہ

جن مشائخین کرام کی اُردو خدمات کا میں نے اس کتاب میں تذکرہ کیا ہے ان کے علاوہ بھی بہت سے ایسے مشائخین دلی کی سرزمین پر ہوئے ہیں جنھوں نے زبانی، یا تقریری طور پر یا اپنی گرانقدر فارسی و عربی تصنیف و تالیف کے ذریعے رائج الوقت زبانوں کے ادب کو اپنے اپنے دور میں فروغ دینے کی خدمات انجام دی ہیں۔ خواہ اُن کا بنیادی مقصد اور مطمح نظر اس کے ذریعے تبلیغِ دین اور صوفی ازم کا فروغ ہی کیوں نہ رہا ہو۔ ایسے مشائخین کے بھی بہت سے اسمائے گرامی سامنے آتے ہیں۔ اگرچہ یہاں اُن کی تصنیف و تالیف اور سوانح وغیرہ کے تعلق سے کوئی واضح تذکرہ عنوان کی تشنگی کے پیش نظر مناسب نہیں معلوم ہوتا۔ لیکن ایسے کچھ مشہور و مقبول مشائخین کے صرف اسمائے گرامی بتانا بھی بے موقع محل نہ ہوگا۔ دلی کے جن مشائخین کرام سے ان کی فارسی یا عربی تصنیف و تالیف کے ذریعے یا زبانی و تقریری طور پر اردو ادب کے فروغ میں کسی بھی قسم کا تعاون بالواسطہ یا بلاواسطہ طور پر ملا اُن میں حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ، حضرت خواجہ شیخ کلیم اللہ ولی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ، حضرت سرمد شہید رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ، حضرت نصیرالدین چراغ دہلی، حضرت خواجہ باقی باللہ وغیرہ کے بھی اسمائے گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ حضرت سرمد کی رباعیات، حضرت خواجہ شیخ کلیم اللہ کی تصنیف مالا بد کلیمی۔ کشکول کلیمی۔ سوار السبیل کلیمی وغیرہ ایسی قابل قدر تصانیف ہیں جو عربی و فارسی سے اردو میں ترجمہ

کی گئیں اور جس کے نتیجہ میں وہ آج تک اردو ادب کے ذخیرہ میں ایک گرانقدر اضافہ کی موجب ہیں۔ اور آج بھی مقبول عام ہیں۔

اس صداقت سے ہرگز ہرگز انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اردو ادب کی ترویج و ترقی میں ہندوستان کے صوفیاء و مشائخین کرام نے بنیادی خدمات اور اہم کردار انجام دیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اردو میں نظم و نثر کا آغاز ہی ملک کے صوفیاء و مشائخین کرام کے حلقے سے ہوا ہے۔ اردو زبان و ادب کے ابتدائی دور کو نظم کا دور قرار دیا جاتا ہے جو دُرست معلوم ہوتا ہے۔ اس کی ایک خاص بنیادی وجہ یہ تھی کہ صوفیاء و مشائخین متقدمین تبلیغ حق اور اپنے صوفی ازم کے مشن کی اشاعت و فروغ کے لیے بمقابلہ نثر کے نظم کو زیادہ مُؤثر و کامیاب ذریعہ سمجھتے تھے اور اس لیے انھوں نے بہ نسبت نثر کے نظم کو پہلے اور زیادہ اہمیت دی۔

بقول محبوب الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ ” انسانی ذہن بہ نسبت نثر کے نظم سے جلد اور زیادہ متاثر ہوتا ہے۔“ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز ہرگز نہیں کہ صوفیاء و مشائخین نے نثر کی اہمیت و افادیت کو قطعی طور پر نظر انداز کر دیا ہو۔ ایسی بات نہیں بلکہ جب اور جہاں جن مواقع پر اِن بزرگوں نے نثر سے کام لینا بہتر اور مناسب سمجھا وہاں نثر سے بھی بے دریغ کام لیا۔ بہر کیف یہ امر مسلّمہ ہے کہ انھوں نے صوفی ازم کے مشن کی تبلیغ و فروغ اور رشد و ہدایت اور دعوت حق عوام النّاس تک پہنچانے کے لیے اردو زبان و ادب ہی کو ذریعہ بنایا اور سہارا لیا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے دینی فریضہ کی ادائیگی اور نیک مقصد کے حصول کے لیے اردو زبان و ادب کو عام فہم، آسان مؤثر و شیریں زبان و بیان کے سانچے میں ڈھالنے کی جدوجہد کی۔ ان بزرگانِ دین نے کبھی خود کو وقت کا بڑا ادیب یا شاعر ہونے کا دعویٰ یا کوشش نہیں کی کیوں کہ اُن کا بنیادی مقصد اور غرض و غایت زبان و ادب کے فروغ سے محض رشد و ہدایت اور پیام حق عوام الناس تک پہنچانا تھا۔ اور اس زبان کو انھوں نے رشد و ہدایت اور صوقی ازم کے فروغ کے لیے آسان اور مناسب ذریعہ سمجھا اس لیے ان کے اپنے بنیادی مقصد اور غرض و غایت کی جدوجہد کے

نتیجہ میں اردو زبان و ادب کو بھی لازمی طور پر از خود ہی بتدریج فروغ حاصل ہوتا گیا۔ اور روز بروز اردو زبان و ادب میں نکھار پیدا ہوتا گیا۔ جس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ تصوّف ادب کی ہر صنف کے لیے آب بقا کا حکم رکھتا ہے۔

بہر حال یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ صوفیاء و مشائخین متقدمین نے بالواسطہ یا بلاواسطہ اردو زبان و ادب کے فروغ اور ترویج و ترقی کے لیے جو خدمات انجام دیں اور کوششیں کیں وہ اردو پر یقیناً ایک بڑے احسان کے مترادف ہیں اور انھیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

اردو ادب کی نشو و نما کی تاریخ میں ملک کے بہت سے صوفیاء و مشائخین کرام کے اسماء گرامی سامنے آتے ہیں۔ ان میں کچھ حضرات ایسے بھی ہیں جو بظاہر صوفیاء و مشائخین کرام کی صف میں شمار نہیں کیے جاتے لیکن ان پر صوفی ہونے کا گمان ہوتا ہے۔ مرزا غالب جیسے رند مشرب کو مسائل تصوف کے بیان پر بڑا فخر و ناز ہے وہ کہتے ہیں ؎

یہ مسائلِ تصوّف یہ ترا بیان غالبؔ
تجھے سب ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

ایسے اور بھی متعدد حضرات کے اسماء گرامی سامنے آتے ہیں، جن کے کلام میں تصوّف کی بے پناہ چاشنی ہے۔ زبان و ادب کے بناؤ سنگار کے لحاظ سے بھی اُنھوں نے حق ادا کیا ہے۔ مسائل تصوّف پر نہایت دلچسپ و موثر انداز بیان و زبان اختیار کیا ہے، مسلک کے رموز و نکات اور باریکیوں پر واضح روشنی ڈالی ہے۔ اور بظاہر ان کی وضع قطع اور زندگی بھی پاکیزہ، متقّی و پرہیزگار اور متشرح نظر آتی ہے لیکن اس کے باوجود کوئی طبقہ انھیں صوفی تصور کرتا ہے اور کوئی انھیں صوفیاء و مشائخین کی صف میں شمار کرنے سے منکر ہے۔ ایسی صورت حال میں اِن حضرات میں کسی کے صوفی ہونے یا نہ ہونے کا کوئی ناطق یا حتمی فیصلہ کیا جانا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن سا ہو جاتا ہے۔

دہلی میں اردو زبان و ادب کی نشو و نما اور ترویج و ترقی کی خدمات انجام دینے والے بزرگانِ سلف کے اسماء گرامی کی فہرست بہت طویل ہے لیکن ان میں سے اکثر

مشائخین کرام کی صف میں شمار نہیں کیے جاتے حالانکہ ان میں سے کچھ ایسے بزرگ بھی ہیں جو لفظ صوفی کے لغوی معنی اور اپنے ظاہری کردار وعمل کے لحاظ سے بظاہر صوفی جیسے ہی نظر آتے ہیں اور اگر وہ صوفیِ کامل نہیں تو اس سے کم درجہ کے یعنی صوفیاء کے نقوش قدم پر چلنے کی حتی المقدور کوشش کرنے والے صوفی منش یا صوفی صفت وغیرہ ہی کہے جا سکتے ہیں۔

بیگم ریحانہ فاروقی

مدیرۂ اعلیٰ آستانہ نئی دہلی

محبوبِ الٰہی حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ

اگر ہم یہ کہیں کہ دلّی میں اردو ادب کی خدمت کے آغاز اور اس کی ترویج و ترقی کے بانی و معمار اوّل حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ ہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ حضرت کی خانقاہ دینی و روحانی تعلیم کا تو مرکز تھی ہی، لیکن یہاں ظاہری تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ محبوب الٰہی یہ چاہتے تھے کہ ایک ایسی ہلکی پھلکی زبان وجود میں آئے جو عوام کے درمیان باہمی خلوص و رابطہ کا آسان ذریعہ بن سکے اور صوفیاء و مشائخین اور علمائے دین بآسانی موثر طور پر تبلیغِ دین کر سکیں، درسِ طریقت و ریاضت دے سکیں اور اس زبان کے ذریعہ بندگانِ خدا کی حقیقی معنوں میں اثر آفریں رہنمائی و رہبری کر سکیں۔ یہ صحیح ہے کہ حضرتؒ نے خود اردو میں کوئی تحریری کام انجام نہیں دیا، جس کا سبب یہی ہو سکتا ہے کہ حضرت موصوفؒ نے عبادت و ریاضت اور مخلوقِ خدا کی بے لوث خدمت کو اوّلیت اور ترجیح دی اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ان مصروفیات کے حلقہ میں رہ کر کوئی تحریری کام کرنے کا وقت نکالنا ممکن ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنے عزیز ترین سعادت مند و فرماں بردار مُرید و شاگرد رشید حضرت امیر خسرو رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کو اس مقصد کے آغاز و حصول کے لیے احساس دیا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ حضرت امیر خسروؒ اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے لیے کامیاب معمار اوّل ثابت ہوں گے۔ چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ حضرت امیر خسروؒ نے جو اردو شاعری کا آغاز کیا اس کا احساس حضرت

خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی جو عزت تھی اور تعلیمات۔ انھوں نے اس ضمن میں امیر خسروؒ کی حوصلہ افزائی و سرپرستی بھی فرمائی جس کی سبب سے اہم اور سالک ترجمانی ایک مثال یہ بھی ہے کہ حضرت محبوب الٰہیؒ کی غیر معمولی نوازشات نے حضرت امیر خسروؒ کو نہایت مختصر سے عرصہ میں ہی مرید کامل کے مرتبہ سے سرفراز کر دیا۔ خوش قسمتی سے اپنے سعادت مند فرماں بردار اور اطاعت شعار مرید کی خوابیدہ صلاحیتوں کو پہلے ہی بھانپ لیا تھا اور وہ اس کی قابل قدر خداداد صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کے لیے بیدار کرنا چاہتے تھے۔ ایک واقعہ بھی اس ضمن میں بیان قابل ذکر ہے کہ امیر خسروؒ نے حضرت محبوب الٰہیؒ کی شان میں ایک قصیدہ تحریر فرمایا۔ جب آپ نے قصیدہ مذکور حضرت کی خدمت میں حاضر ہو کر سنایا تو محبوب الٰہیؒ بہت خوش ہوئے اور فرمایا "مانگ خسرو کیا مانگتا ہے؟" خسروؒ نے مؤدبانہ عرض کیا "حضرت! کلام میں شیرینی اور درد چاہتا ہوں۔" محبوب الٰہیؒ نے جواباً ارشاد فرمایا "ہماری چارپائی کے نیچے ایک طشت میں کچھ شکر رکھی ہے اس میں سے تھوڑی کھا لو۔" ____ چنانچہ خسروؒ نے حکم کی تعمیل کی اور اس واقعہ کے بعد سے آپ کے کلام میں اس بلا کا سوز و درد اور شیرینی پیدا ہو گئی کہ جو بھی سنتا تھا بے اختیار وجد کرنے لگتا تھا۔ خسروؒ کی اردو پہیلیاں، بولیاں، دوہے، دو سخنے، انمل اور کلام وغیرہ میں قدرتی طور پر ایسی مٹھاس اور ایک کشش پائی جاتی ہے جو سننے اور پڑھنے والوں کو اپنی طرف کلیتہً متوجہ کیے بغیر نہیں رہتی۔

اس صداقت سے کسی کو انحراف نہیں ہو سکتا یہ ایک مسلمہ تحقیقی امر ہے کہ اردو کے ابتدائی دور میں صوفیا و مشائخ ہی وہ تھے جنہوں نے کچھ فارسی، ہندی، سنسکرت اور کچھ برج بھاشا وغیرہ میں اردو کے وہ رائج الوقت الفاظ خلط ملط کر کے جو اس دور کے عوام کی زبانوں پر بہ وقت رواں تھے اور عام طور پر روز مرہ کی بول چال میں استعمال کیے جاتے تھے انھیں اپنا کر ایک جدید اسلوب مرتب کیا جس کے ذریعے وہ اپنی تحریروں یا تقریروں میں اپنے بنیادی مقاصد، پیام حق اور صوفی ازم کو عوام الناس تک پہنچانے کی لگاتار سرگرم کوشش کرتے رہے اور بلا شبہ وہ اپنی اس کوشش و سعی میں

خاطر خواہ کامیاب بھی ہوئے۔

محققین کا ایک بڑا طبقہ اس صداقت پر بھی پوری طرح متفق ہے کہ اردو میں نظم و نثر کی سب سے پہلی تصنیف حضرت امیر خسرو (تاریخ ولادت ۶۵۲ھ مطابق ۱۲۵۴ء وفات شوال ۷۲۵ھ مطابق ۱۳۵۲ء) کی کتاب "خالق باری" ہے جو اس وقت خاص طور پر مبتدی طلبار کے لیے لکھی گئی جو نہایت مفید و کامیاب ثابت ہوئی۔ اور اندازہ کے مطابق مذکورہ کتاب صدیوں تک درسگاہوں اور مکتبوں میں رائج رہی۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اس امر کا واضح اور نمایاں طور پر اندازہ ہوتا ہے کہ اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کی داغ بیل کس طرح پڑی اور پھر اسے انگلی پکڑ کر چلنا کن بزرگوں نے اور کس طرح سکھایا۔ اردو کو پروان چڑھانے والے بزرگوں کی فہرست طویل ہے لیکن یہاں اس کی تفصیل کے اظہار کی اس لیے ضرورت نہیں کیونکہ کتاب ہٰذا کا مقصد و موضوع صرف دہلی ہی کے مشائخین و صوفیائے کرام کی ادبی خدمات تک محدود ہے اس لیے حسب تحقیق و بساط مجھے اسی دائرہ کے اندر قلمی سفر اختیار کرنا ہے۔ اردو کی ابتدائی تخم ریزی کے بعد سے گیارہویں صدی تک ہندوستان کے مختلف گوشوں میں مشائخین وقت اپنے اپنے طور پر تحریر و تقریر کے ذریعے حسب وسائل و مقدرت نہالِ اردو کی آبیاری کرتے رہے۔ گیارہویں صدی تک جن مشائخین کرام نے اردو کی خدمات انجام دیں ان میں بظاہر دہلی کی کوئی قابل ذکر صوفی شخصیت نظر نہیں آتی البتہ بیرون دلی ہندوستان کے گوشوں میں بالخصوص دکن وغیرہ میں ایسے مشائخین کرام کے اسمائے گرامی سامنے آتے ہیں جنھوں نے اردو زبان و ادب کی قابل قدر و لائق تحسین ابتدائی خدمات انجام دیں۔

گیارہویں صدی کے بعد اردو نے ہندوستان میں ترقی کی پہلی منزل میں قدم رکھا تو بیشتر عوام کچھ نہ کچھ اردو آشنا ہو چکے تھے۔ جیسے جیسے اردو زبان و ادب میں مٹھاس اور شیرینی، سلاست و لطافت پاکیزگی و نفاست کا اضافہ ہوتا گیا ویسے ویسے عوام و خواص کے دلوں میں اردو زبان و ادب کا معیار و مقام بلند تر ہوتا گیا۔ اور عشق پیچاں کی بیل کی

طرح آناً فاناً اردو پھلنے پھولنے لگی۔ اچھے اچھے سخن سنج، سخن فہم پیدا ہوتے گئے جنھوں نے ذوق و لگن کے ساتھ خونِ دل سے نہال اردو کی آبیاری کی، پروان چڑھایا اور منزل شباب تک پہنچا کر بارآور بنایا۔

چونکہ یہاں صرف دلّی کے مشائخین کی اردو ادبی خدمات کا تذکرہ مقصود ہے اس لیے ہم حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کے عہد سے آغاز مناسب سمجھتے ہیں۔

دلدادۂ نظامؒ و قطبؒ و فریدؒ و خواجہؒ
ظلِ حبیبِ رحمٰن، حضرت امیر خسروؒ

ادیب و شاعر و شیخ و ولی و عالم و عارف
طوطیِ ہند سلطان الشعراء

حضرت امیر خسروؒ

حضرت خواجہ امیر خسرو رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو اس براعظم کے اولیاء اللہ اور بزرگانِ دین میں جو مقام و مرتبہ حاصل ہے وہ دیگر بزرگان دین کے مرتبہ سے مختلف ایک الگ نوعیت کا حامل ہے۔ حضرت امیر خسروؒ کی ایک سب سے اہم اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ جہاں بہت بڑے درویش تھے وہاں اپنے زمانہ کے سب سے بڑے اور ممتاز اہل قلم بھی تھے۔ آپ کی علمی استعداد و قابلیت اور صلاحیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ مصلح اعظم حضرت شیخ سعدی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو اس امر پر فخر و ناز تھا کہ ان کے ہم عصروں میں حضرت امیر خسروؒ جیسا پختہ کار اہل قلم موجود ہے۔ حالانکہ حضرت سعدیؒ کے عہد پیری میں حضرت امیر خسروؒ بالکل نوجوان تھے۔ حضرت امیر خسروؒ کو اس اعتبار سے بھی بہت بڑی عظمت حاصل ہے کہ آپ ہی نے اس برعظیم میں سب سے پہلے اردو یعنی ہندوستانی زبان کا سنگ بنیاد رکھا۔ چنانچہ حضرت امیر خسروؒ کی برکت سے

یہ زبان اس برّ عظیم میں ایسی پھولی پھلی اور بار آور ہوئی کہ اس نے صرف چند ہی صدیوں کے اندر ہزاروں برس کی پرانی زبانوں کو شیرینی و لطافت اور فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بہت پیچھے چھوڑ دیا۔ اور خود آناً فاناً ترقی کے مدارج طے کرتی ہوئی منزلِ عروج کو پہنچی۔

حضرت امیر خسروؒ کے والد محترم کا نام نامی امیر سیف الدین محمود تھا جو بلخ (ترکستان) کے امیرزادوں میں سے تھے اور بلخ سے، ہجرت کرنے کے بعد سلطان شمس الدین التمشؒ کے عہد حکومت میں موضع پٹیالی ضلع ایٹہ میں آکر آباد ہوئے۔ بعض محققین کے مطابق۔

امیر سیف الدین محمود ایٹہ سے دہلی آئے تو اپنے خاندانی اوصاف اور خداداد غیر معمولی استعداد و لیاقت کی بنا پر بادشاہ کے مقرّبین میں شامل ہو گئے۔ دلّی آنے کے بعد آپ کی شادی نواب عماد الملک کی صاحبزادی سے ہو گئی، یہ صاحبزادی علم و فضل میں خاص درجہ کی مالک تھیں۔ ان کے بطن سے امیر محمود کے یہاں تین بیٹے پیدا ہوئے۔

۱۔ اعزالدین علی شاہؒ۔ جو سب سے بڑے تھے (۲) حسام الدینؒ اور (۳) حضرت امیر خسروؒ جو سب سے چھوٹے تھے ۶۵۳ ھ مطابق ۱۲۵۵ء میں شاہانِ غلامان کے عہد حکومت میں پیدا ہوئے۔ لیکن اس میں اختلاف بھی پایا جاتا ہے۔ ایک محقق جناب ممتاز حسین کی تحقیقی تصنیف بعنوان "امیرِ خسروؒ دہلوی، حیات اور شاعری" جو ۱۹۷۶ء میں پاکستان میں شائع ہوئی اور فروری ۱۹۸۲ء میں ہندوستان میں شائع کی گئی ہے اس میں محقق موصوف نے اس موضوع پر طویل بحث و مباحثہ کے بعد یہ نتیجہ برآمد کیا ہے کہ حضرت امیر خسروؒ دہلی ہی میں پیدا ہوئے، بعض کتب میں آپ کا پیدائشی مقام پٹیالہ یا قصبہ پٹیالی ضلع ایٹہ وغیرہ کا جو ذکر کیا گیا ہے وہ غلط ہے۔ محقق موصوف نے حضرت خسروؒ کی پیدائش شہنشاہ ہمایوں کے عہد میں ۱۲۵۳ء میں دہلی ہی میں ہونا درست قرار دیا ہے۔

بہرحال اس بحث سے قطع نظر پیدائش کے بعد ان کا نام ابوالحسن رکھا گیا لیکن آپ کا اصلی نام "خسرؔو" کے تخلص میں دب گیا۔ چنانچہ دنیا بھر میں آپ امیر خسروؒ ہی کے نام سے مشہور و مقبول ہوئے۔

آپ کے حالات زندگی کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جب امیر خسروؒ پیدا ہوئے تو آپؒ کے والد ماجد آپؒ کو پیدائش کے فوراً بعد برکت کے لیے ایک مجذوب کے پاس لے گئے۔ مجذوب نے دیکھتے ہی کہا۔ " امیر! یہ لڑکا آسمانِ تصوّف کا آفتاب اور ہر فن میں صاحب کمال ہوگا۔ اس کا نام قیامت تک روشن رہے گا۔ لوگ اس کے کلام کو پڑھیں گے اور کیف و سرور حاصل کریں گے۔"

حضرت امیر خسروؒ کی ابتدائی تعلیم باپ اور بھائیوں کی زیر نگرانی میں ہو رہی تھی ابھی آپ اپنی عمر رواں کی نویں منزل میں ہی گامزن تھے کہ آپ کے والد محترم پچاسی سال کی عمر میں ایک لڑائی میں شہید ہو گئے اور اس طرح باپ کا سایہ آپ کے سر سے اُٹھ گیا۔ والد کے انتقال کے بعد حضرت امیر و خسروؒ کی تعلیم و تربیت آپ کے نانا نواب عماد الملک کی زیر نگرانی ہوتی رہی جن کی عمر اس وقت ایک سو تیرہ ۱۱۳ سال کی تھی۔ نواب عماد الملک نے اپنے ہونہار نواسہ کو فقہ، حدیث، منطق اور دیگر بہت سے علوم میں اعلیٰ تعلیم دلائی یہاں تک کہ نہایت کم عمر و کمسنی میں ہی آپ کا شمار فضلائے وقت میں ہونے لگا۔ شعر و شاعری سے آپ کو فطری لگاؤ تھا۔ بچپن ہی سے بلا جھجک شعر کہتے تھے اور اپنے بڑے بھائی اعزالدین سے اصلاح لیا کرتے تھے۔ شعر و سخن میں آپ کے استاد آپؒ کے بڑے بھائی اعزالدین ہی تھے۔

علوم ظاہری کی تکمیل کے بعد آپ کو باطنی علوم کی جانب رغبت و توجہ ہوئی یہ وہ زمانہ تھا کہ سارے ہندوستان میں حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کے باطنی کمالات کا چرچہ تھا۔ حضرت امیر خسروؒ، حضرت محبوب الٰہی کی شہرت سن کر جب حضرت کی خدمت میں علوم باطنی کی تربیت حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوئے تو حضرتؒ آپؒ کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور حضرت امیر خسروؒ، محبوب الٰہیؒ کے حلقۂ مریدین میں شامل ہو گئے۔

حضرت امیر خسروؒ کو چونکہ علوم باطنی سے قدرتی طور پر لگاؤ تھا اس لیے انھوں نے حضرت محبوب الٰہیؒ جیسے عظیم رہنما کی زیر نگرانی راہ سلوک کی منازل بڑی تیزی کے ساتھ

طے کرنی شروع کر دیں۔ آپ عبادت و ریاضت میں سخت محنت کرنے سے گھبراتے نہیں تھے اور روحانیت کی جانب آپ کے اس غیر معمولی رجحانِ طبع نے حضرت محبوب الٰہیؒ کو خصوصیت کے ساتھ اپنی جانب متوجہ کر لیا اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ حضرت محبوب الٰہیؒ آپ سے بے حد محبت و شفقت فرمانے لگے۔ حضرت محبوب الٰہی کی نظروں میں امیر خسروؒ کی کس قدر، قدر و منزلت تھی اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ایک دن حضرت محبوب الٰہیؒ نے آپؒ سے ارشاد فرمایا ــــ "اے ترک میں سب سے تنگ آ جاتا ہوں یہاں تک کہ خود اپنے آپ سے بھی مگر تم سے کبھی تنگ نہیں ہوتا"۔ غرض کہ محبوب الٰہیؒ کی غیر معمولی نوازشات و نگاہِ لطف نے آپؒ کو مختصر سے عرصہ میں مرد کامل کا درجہ عطا فرما دیا۔ اور شعر و ادب کے میدان میں بھی حضرتؒ کی حوصلہ افزائیوں اور دعاؤں سے خسروؒ کو عوام و خواص میں امتیازی شرف قبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل ہونے لگی۔ انتہا ہے کہ آپ محض تعلیم یافتہ اہل ذوق طبقہ کے مردوں ہی کے محبوب شاعر اور ادیب نہیں تھے بلکہ خواتین کے طبقہ میں بھی آپ کو ہر دلعزیزی اور قبولیت کا فخر حاصل تھا۔

بقول خان بہادر مولوی سیّد اشرف حسین اگرچہ اکثر نامور شعراء و نثر نگاروں کی قدر دانی ان کی حیات میں کما حقہٗ نہیں ہوئی لیکن یہ امتیازی خصوصیت حضرت امیر خسروؒ ہی کو حاصل ہے کہ ان کی قدر و منزلت ہر طبقہ کے عوام مرد و خواتین میں ہوتی رہی، سلطان غیاث الدین بلبن سے لے کر سلطان محمد شاہ تغلق تک (یعنی ۶۶۴ھ سے ۷۲۵ھ تک) تمام سلاطینِ وقت امراء و ارباب اقتدار سبھی آپ کے قدر دان رہے۔ امراء و سلاطینِ وقت بڑے بڑے تحائف اور انعامات سے بھی آپ کو نوازتے رہے۔ آپ کے کلام کا مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت بھی واضح اور نمایاں ہوتی ہے کہ آپ بالطبع سلاطین و امراء کی جھوٹی تعریفیں لکھنا اور خوشنودی حاصل کرنے کے لیے جھوٹے قصیدے کہنا قطعی پسند نہ کرتے تھے۔ بلکہ اکثر و بیشتر ان کو اخلاقی و انتظامی تعلیمات میں حضرت شیخ سعدیؒ کی طرح حق و صداقت پسندانہ رہنمائی کا درس دیتے تھے۔ وہ عربی، فارسی، ترکی، ہندی اور کئی

رائج الوقت زبانوں کے عالم و فاضل تھے اور نظم و نثر دونوں اصناف پر یکساں عبور اور کمال و قدرت رکھتے تھے۔ آپ کی صرف منظوم تصانیف ہی ننانوے^{99} بیان کی جاتی ہیں اور اشعار کی تعداد (علاوہ ہندی کلام کے) چار اور پانچ لاکھ کے مابین بتائی جاتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس میں کچھ مبالغہ ہو لیکن صاحب "تذکرہ آتشکدہ" کہتے ہیں کہ: "حضرت امیر خسروؒ کے ایک لاکھ اشعار تو خود میری نظر سے گذرے ہیں"۔ مولانا ضیاء الدین برنی (صاحبِ تاریخ فیروز شاہی) لکھتے ہیں کہ "نظم و نثر میں گویا انھوں نے ایک کتب خانہ تصنیف کر دیا ہے"۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت امیر خسروؒ نے وہ معرکتہ آلارا کتابیں لکھی ہیں کہ سبعہ معلّقہ اور سواطع الالہام کی طرح اُن کا جواب نہ نکل سکا۔ مگر افسوس کہ امتدادِ زمانہ کے ہاتھوں یہ قابلِ ناز علمی خزانہ قریب قریب برباد ہو گیا جو کچھ باقی رہ گیا ہے اس پر قدرے بسیط تبصرہ کافی موجب دلچسپی ہوتا مگر بحث طویل ہے اور فرصت قلیل اس لیے اس موقع پر ان میں سے چند ایک کے صرف نام ہی گنوانے پر اکتفا کی جاتی ہے۔ جو زیادہ اہم ہیں۔ اور جن میں بہت سی تصانیف اردو ترجمہ میں بھی شائع ہو کر قبولِ عام کی سند حاصل کر چکی ہیں۔

۱۔ مثنوی قران السعدین۔ ۲۔ مثنوی مطلع الانوار۔ ۳۔ مثنوی شیریں خسروؒ۔ ۴۔ مثنوی لیلیٰ مجنوں۔ ۵۔ مثنوی آئینہ سکندری یا سکندر نامہ۔ ۶۔ مثنوی ہشت بہشت۔ ۷۔ مثنوی خضر خاں، ۸۔ مثنوی نُہ سپہر۔ ۹۔ مثنوی تغلق نامہ۔ ۱۰۔ خزائن الفتوح یا تاریخ علائی۔ ۱۱۔ انشائے خسروؒ یا خیالات خسروؒ۔ ۱۲۔ رسائل الاعجاز یا اعجاز خسروؒی۔ ۱۳۔ افضل الفوائد۔ ۱۴۔ راحت المحبین۔ ۱۵۔ جواہر البحر، ۱۶۔ خالق باری (اس میں کچھ اختلاف ہے) ان کے علاوہ پانچ دیوان ہیں۔ ۱۷۔ تحفۃ الصغر (یعنی وہ **تخلیقات** جو حضرت امیر خسروؒ نے ۱۶ برس سے ۱۹ برس تک کی عمر میں تخلیق کیں)، ۱۸۔ دیوان وسط الحیات (یعنی وہ **تخلیقات** جو انھوں نے بیس^{۲۰} برس کی عمر سے چونتیس^{۳۴} برس عمر تک تخلیق کیں)، ۱۹۔ عزۃ الکمال (یہ اُن کا تیسرا اور سب سے بڑا دیوان ہے ۲۰۔ دیوان لبقیہ نقیہ (یعنی وہ دیوان جس میں حضرت امیر خسروؒ کی **تخلیقات** ۵۰ برس سے ۶۴ برس تک کی عمر کی ہیں) ۲۱۔ نہایۃ الکمال (یہ حضرت

امیر خسروؔ کا آخری دیوان ہے)

ان سب پر مستزاد یہ ہے کہ تذکرہ عرفات میں اوحدی کا بیان ہے کہ حضرت امیر خسروؔ کا جتنا کلام فارسی میں ہے تقریباً اتنا ہی برج بھاشا (اردو) میں ہے مگر افسوس کہ اُس گنج شائیگاں کا آج کہیں نشان تک نہیں ہے۔ حیرت ہے کہ اتنی سی عمر میں انھوں نے کس طرح اتنی تصانیف کیں جب کہ وہ ملازمت پیشہ بھی تھے اور مصروفیات بہت تھیں جیساکہ وہ خود فرماتے ہیں ؎

باشد ز برائے نفس خودرائے ؛ پیش چو خودی ستادہ برپائے
تا خوں نرود ز پائے تا سر ؛ دستم نشود ز آب کس تر

ان غیر معمولی باتوں کے پیش نظر یہ کہنا پڑتا ہے کہ حضرت امیر خسروؔ صانع حقیقی کے ایک خاص شاہکار تھے۔ اردو بولنے والے اصحاب جانتے ہیں کہ ہماری اردو زبان کی ماں برج بھاشا ہے جو ہندوستان میں اسلام آنے سے قبل شمالی ہند میں بولی جاتی تھی۔ جو مسلمان ہندوستان میں آئے وہ فارسی بولتے تھے جس میں عربی اور ترکی کے الفاظ بکثرت موجود تھے۔ ہر وقت ایک جگہ رہنے سہنے اور ملنے جلنے سے ایک تیسری زبان وجود میں آئی۔ حضرت امیر خسروؔ کی اختراع پسند طبیعت نے اس میں بہت کچھ جوہر دکھائے یعنی برج بھاشا کی زمین میں فارسی کا بیج بویا، پہلے وہ ہندی بنی، پھر ریختہ کہلائی اور پھر آخر کار دنیا بھر میں اُردو کے نام سے مشہور ہوئی۔ حضرت امیر خسروؔ کی پہیلیاں، مکرنیاں، انمل، دوسخنے وغیرہ وغیرہ وہ یادگاریں ہیں جو کبھی مٹ نہیں سکتیں۔ چونکہ امیر خسروؔ حتی الوسع کسی کو آزردہ اور مایوس نہ کرتے تھے۔ اس لیے لوگوں کی فرمائش پر وہ پہیلیاں اور انمل وغیرہ بھی برجستہ نظم کر دیا کرتے تھے جو آج تک لوگوں کی زبان پر ہیں۔ اگرچہ فن شاعری کے لحاظ سے یہ کچھ بلند مرتبہ چیزیں نہیں ہیں تاہم ان سے مصنف کی جدت پسندی و خوش مذاقی اور زود گوئی و حاضر دماغی کا پتہ چلتا ہے۔ مثلاً ایک مشہور پہیلی ہے :۔

چار مہینے بہت چلے اور آٹھ مہینے تھوری
امیر خسروؔ یوں کہیں تو بوجھ پہیلی موری

اس پہیلی کا آخری لفظ ذو معنی ہے ''موری'' پانی نکلنے کی نالی کو بھی کہتے ہیں جو کہ اس پہیلی کا صحیح حل ہے۔

آپ کی اردو پہیلیاں آج تک سینکڑوں برس گزرنے کے باوجود زبان زد خاص و عام ہیں ایک پہیلی اور بطور نمونہ ملاحظہ ہو ؎

دس ناری کا ایک ہی نر
بستی باہر وا کا گھر
پیٹھ سخت اور پیٹ نرم
مُنہ میٹھا تاثیر گرم
(خربوزہ)

حضرت امیر خسروؒ کی انمل نویسی کی بھی ایک مثال ملاحظہ کیجیے۔ مشہور واقعہ ہے کہ چار عورتیں ایک کنوئیں پر پانی بھر رہی تھیں۔ امیر خسروؒ اُدھر سے گزرے انھیں پیاس لگ رہی تھی، پانی طلب کیا، چونکہ ہر دلعزیز تھے اور سب آپ کے کمالاتِ شاعری کے معترف تھے اس لیے اُن عورتوں نے بھی کہا کہ ہم لوگ اس وقت اپنے آج کے واقعات کا ذکر کر رہے تھے ان کو نظم کر دیجیے تب ہم آپ کو پانی پلائیں گے۔ چنانچہ پہلی عورت نے کہا کہ آج میں نے نہایت لذیذ کھیر پکائی تھی اور ایندھن جب کم پڑ گیا تو اس دوسری عورت نے اپنا پُرانا چرخہ اپنے گھر سے لاکر دے دیا کہ اس کا ایندھن بناؤ۔ جب کھیر پک کر تیار ہو گئی تو یہ تیسری عورت جو ڈھول بجا رہی تھی اس کے پاس ہم دونوں تھوڑی دیر کے لیے جا بیٹھے اور اس درمیان میں ایک کتّا آگیا۔ حضرت امیر خسروؒ نے فی البدیہہ ان بے ربط باتوں کو ایک شعر میں نظم کر دیا جو حسبِ ذیل ہے ؎

کھیر پکائی جتن سے چرخہ دیا جلا
آیا کتّا کھا گیا، تو بیٹھی ڈھول بجا

انمل اور پہیلی کا ایک مشترکہ نمونہ ملاحظہ ہو ؎

ادروں کی چو پہری باجے چموں کی اٹھ پہری
باہر کا کوئی آئے ناہیں آئیں سارے شہری
صاف صوف کر آگے راکھے جاہیں نائیں توسل
اورن کے جہاں سینگ سماوے چموں کے واں موسل

خسرو کا کچھ کلام ایسا بھی ہے جس میں ایک مصرعہ فارسی کا اور دوسرا مصرعہ یعنی مصرعہ ثانی ہندی/ اردو کا ہے۔ اس دو لسانی آمیزش کا ایک دلکش نمونہ ملاحظہ ہو ؎

زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بنیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
شبانِ ہجراں دراز چوں زلف و روزِ وصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں
یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے جو جا سنائے پیارے پی کو ہماری بتیاں
چو شمع سوزاں چو ذرّہ حیراں ز مہرِ آں ماہ بکشتم آخر
نہ نیند نیناں نہ انگ چیناں نہ آپ آویں نہ بھیجے پتیاں

علاوہ ان تاریخی و ادبی خدمات کے جو حضرت امیر خسرو نے اپنی تصانیف کے ذریعے انجام دیں، فن موسیقی پر بھی اُن کا بڑا احسان ہے۔ بڑے بڑے صاحبِ کمال گویّے ان کی شاگردی کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتے تھے۔ آپؒ کے اخلاق و آداب کے متعلق آپ کے سوانح نویس بالاتفاق لکھتے ہیں کہ آپ بہت خوش مزاج، خوش اخلاق سخی و مہمان نواز، خدا سے ڈرنے والے اور غریبوں اور کمزوروں کی مدد کرنے والے تھے۔ آپ کا مقولہ تھا ”ہر کہ خود را بیند، خدائے را نہ بیند، و ہر کہ از خدا نترسد از و باید ترسید“ (جو اپنے آپ کو دیکھتا ہے وہ خدا کو نہیں دیکھ پاتا، اور جو خدا سے نہیں ڈرتا اس سے ڈرنا چاہیئے)

حضرت امیر خسرو کو ''شہید محبت'' بھی کہا جاتا ہے اور اس کے ثبوت کے طور پر یہ واقعہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ حضرت امیر خسروؒ اپنے مرشد محترم حضرت خواجہ نظام الدین اولیاؒ کی وفات حسرت آیات کے وقت دلی سے باہر بادشاہِ وقت غیاث الدین تغلق کے ہمراہ بنگال کی مہم پر تشریف لے گئے تھے اور وہیں آپ کو اپنے پیر و مرشد کے وصال کی اندوہناک اطلاع پہنچی تو آپ فوراً ملازمت سے مستعفی ہو کر دلی آئے اور اپنے پیر و مرشد کے مزار مقدس پر پہنچ کر بے اختیار ایک ایسی چیخ ماری کہ بے ہوش ہو گئے۔ اور جب ہوش میں آئے تو آپ کے لبوں پر برجستہ جاری تھا ؎

گوری سوئے سیج پر مُکھ پہ ڈالے کیس
چل خسرو گھر اپنے سانجھ ہوئی جو دیس

اکثر کتب میں تحریر ہے کہ حضرت امیر خسروؒ اپنا مذکورہ شعر چھ ماہ تک دہراتے رہے اور اپنے پیر و مرشد کے مزار پاک پر جاروب کشی فرماتے رہے اور اسی عالم میں ۲۷ ستمبر ۱۳۲۵ء کو راہی ملک بقا ہوئے اور اپنے پیر و مرشد کے قریب دفن کیے گئے۔

حضرت شیخ عبدالحق محدّث دہلویؒ

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ بُخارا کے ایک ممتاز دیندار وخدا پرست خاندان کے چشم وچراغ تھے جو سلطان علاءالدین خلجی کے عہد حکومت میں بخارا سے ہجرت کر کے ہندوستان آکر دارالسلطنت دلی میں آباد ہوگیا تھا۔ حضرت شیخ کے والد ماجد کا اسم گرامی شیخ سیف الدّینؒ تھا جو اپنے وقت کے مشہور ومقبول مشائخین میں سے ایک تھے۔ خود شیخ عبدالحقؒ نے "اخبارالاخیار" میں اپنے والد ماجد کے حالات تفصیل سے بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> "حضرت شیخ سیف الدین ۹۲۰ھ مطابق ۱۵۱۴ء کو دہلی میں پیدا ہوئے اور ۲۷ر شعبان ۹۹۰ھ مطابق ۱۵۸۲ء کو وفات پائی۔" انھوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کے "والد بزرگوار سلسلہ سہروردیہ کے ایک عالم دین وصوفی کامل سے بیعت تھے۔ لیکن اُن کو خرقہ خلافت حضرت شیخ امان اللہؒ پانی پتی سے ملا تھا اور تصوّف کی مکمل تربیت بھی انھیں سے ملی تھی اور شیخ امان اللہؒ نے ہی ان کو خرقہ خلافت پہنایا تھا اور خود اپنے دستِ مبارک سے خلافت نامہ تحریر کر کے عنایت فرمایا تھا۔"

حضرت شیخ عبدالحقؒ نے مغلیہ دور حکومت کے تین عظیم الشان بادشاہوں کا دورِ اقتدار دیکھا۔ اکبر کی تخت نشینی کے وقت حضرت شیخ کی عمر چار سال اور دس ماہ کی تھی

۱۵۱۱۵۴

اور جب اُن کا وصال ہوا تو شاہجہاں کی حکومت کا سولھواں سال تھا۔ تقریباً ۹۸۰ھ میں حضرت شیخ تحصیل علم سے فارغ ہو چکے تھے۔ اس وقت تک اکبر ایک صوفی منش بادشاہ تھا۔ لیکن اس کے تین سال بعد اُس کے مزاج میں تبدیلی اور دین حق سے انحراف و برہمی پیدا ہونی شروع ہو گئی اور ۹۹۰ھ یا ۹۹۶ھ کے مابین جب حضرت شیخ فتح پور تشریف لے گئے تو اکبر اسلام سے پھر چکا تھا۔ جن حق پرستوں نے اس کے خلاف علی الاعلان لب کشائی کی ہمت و جرأت کی وہ اپنی جزا پا چکے تھے — (ہمارا مقصد یہاں عہد اکبری کی تفصیل و تاریخ بیان کرنا نہیں اس کے لیے قارئین کرام کو ملّا عبدالقادر بدایونی کی تاریخ مطالعہ کرنا ہوگا) ہمارا مقصد یہاں اس دور کے حالات و ماحول کی اشارۃً نشاندہی سے ہے اس وقت حضرت شیخ کی شخصی اہمیت اور اُن کی متعلقہ تحریری و تقریری، دینی و تعمیری سرگرمیوں کا اظہار کرنا ہے جو اُس دور پُرآشوب کے حالات و ماحول سے وابستہ ہیں۔ غرض یہ کہ اکبری دین الٰہی کے خلاف جس کسی نے بھی لب کشائی کی اُسے منزل دار سے گزرنا پڑا۔ ملّا محمد یزدی نے جو وقت کے بڑے اور معروف شیعی عالم اور جونپور کے قاضی القضاۃ کے منصب پر فائز تھے علی الاعلان بادشاہ کی بے دینی اور اس پر فتویٰ جہاد دیا۔ بنگال کے قاضی القضاۃ نے بھی یہی صدا لگائی جس کی جزا ان دونوں علمار کو یہ ملی کہ ایک شکستہ کشتی میں بٹھا کر دریا میں ڈبو دیے گئے۔ قاضی محمد یعقوب کو بھی کسی طرح ختم کر دیا گیا۔ قطب الدین خاں کوکا اور شہباز خاں کمبوہ پر بھی ظلم و تشدد کے پہاڑ ٹوٹے، خواجہ منصور کو مرزا حکیم حاکم کابل سے اسی ضمن میں خط و کتابت کے جرم میں منزل دار سے گزرنا پڑا۔ غرض یہ کہ جن علمار و مفتیانِ وقت نے بھی لب کشائی کی جرأت کی انھیں چن چن کر شہید کر دیا گیا۔ ان حالات و ماحول میں جب حضرت شیخ نے فتح پور کی سرزمین پر قدم رکھا تو جلد ہی انھیں محسوس ہو گیا کہ وہ جہاں اور جس مقام پر آئے ہیں وہ جگہ دین و تقویٰ کا مقتل ہے۔ اور انھوں نے صورتِ حال کا بغور جائزہ لینے اور سمجھنے کے بعد اس حقیقت کو بھی خوب اچھی طرح محسوس کر لیا کہ الحاد و بے دینی کا یہ سیلاب کن سوتوں سے اُبل رہا ہے اور یہ کہ جب تک ان سوتوں اور چشموں کو

بند نہیں کیا جائے گا صراطِ حق سے بھٹکنے والے بندگان خدا کے عقائد و ایمان میں راستی واستحکام پیدا کرنا ممکن نہیں ہوگا۔ صورتِ حال کے خلاف علی الاعلان جرأت لب کشائی کرکے جان کی قربانی تو ضرور دی جاسکتی ہے لیکن الحاد کے اس امڈتے ہوئے سیلاب کو نہیں روکا جاسکتا۔ حضرت شیخ نے صورت حال سے سخت متاثر ہوکر اللہ تبارک وتعالیٰ کے حضور میں بصمیم قلب دعا کی کہ۔ "اے بارِالٰہ اپنے بندوں کو الحاد و بے دینی کے اس فتنہ سے محفوظ رکھ اور فتنہ کے خاتمہ کے لیے غیب سے اسباب و وسائل مہیا فرماکر ہمارے ایمان وعقیدہ میں پختگی اور ہمیں اس فتنہ سے نبرد آزمائی کی ہمت اورطاقت عطا فرما۔" دعائے شیخ بارگاہ خداوندی میں مستجاب ہوئی اور اس ضمن میں اللہ رب العزت نے حضرت شیخ کی رہنمائی ودستگیری فرمائی۔ آپ فتحپور سے فوراً دہلی واپس تشریف لے آئے اور چند دن قیام کے بعد حج بیت اللہ شریف کے لیے روانہ ہوگئے اور طویل عرصہ حجاز میں مقیم رہ کر حضرت شیخ نے دین حق کو اس کے اصل سرچشموں، کتاب وسنت کے ذریعہ حاصل کیا اور اس علم بے بہا سے فیض یاب ہوکر سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت سے شرف یاب ہوکر ۱۰۰۰ھ میں ہندوستان واپس آئے اور اپنے وطن مالوف دہلی کے ایک گوشہ میں قال اللہ وقال الرسول کی مسند بچھائی قلم دان سنبھالا اور مسلمانوں کے عقائد وخیالات میں ازسرنو راستی وپختگی پیدا کرنے کی جدوجہد میں پوری تندہی اور سرگرمی سے مصروف ہوگئے۔ انھوں نے ایک طرف زبان وبیان کے ذریعے کتاب وسنت کے علم اور ارشادات ربّانی کی تبلیغ کی اور دوسری جانب قلم کے ذریعے امراء وعمایدین سلطنت کی اصلاح وترویجِ دین کے لیے سرگرم عمل ہوئے اکبر شاہی کے دین الٰہی نے ابھی رواجِ عام نہیں پایا تھا اور اکثر امراء علماء جو اسلامی عقائد پر تو قائم تھے لیکن شاہی مظالم اور دباؤ کے سبب مُہر بلب زندگی بسر کر رہے تھے انھیں حضرت شیخ کی ان مجاہدانہ سرگرمیوں سے سہارا اور موقع مل گیا۔ اور پھر انھوں نے بے دینی کے اس امڈتے ہوئے سیلاب اور اس فتنہ کو ختم کرنے کے لیے شیخ کو اپنا بھرپور تعاون دیا۔ اور آخر کار اللہ تبارک وتعالیٰ کے فضل وکرم سے ان حق پرست بوریا

نشینوں کو اپنے نیک مقصد میں خاطر خواہ کامیابی و کامرانی نصیب ہوئی۔

حضرت شیخ عبدالحق محدّث دہلوی ہندوستان کے پہلے محدّث ہیں جو اپنی عظیم دینی علمی، ادبی خدمات اور اپنے ذوق تصوّف اور اپنی گرانقدر کثیر التعداد تصانیف و تالیف کے اعتبار سے عالم اسلام میں متعارف و مقبول ہیں. آپ ہی کی ذات گرامی سے ہندوستان کی سرزمین سے سب سے پہلے علوم حدیث کے چشمے پھوٹے. آپ اپنی تمام زندگی تبلیغ اسلام، ترویج دین، تصیح عقائد کی جدو جہد اور تصوّف کے فروغ میں صرف کی. حضرت شیخ کی سوانح حیات سے متعلق محققین ورمورّخین کے جو بھی تذکرے اور احساسات اب تک نظر سے گزرے اُن کی روشنی میں اگر شیخ کے وفور علم کا بہ نظر غائر جائزہ لیا جائے تو بیشک حضرت شیخ کی شخصیت میں ایک ایسی انفرادیت اور جامعیت محسوس ہوتی ہے جو عام طور پر لوگوں کو بہت کم اور خال خال نصیب ہوتی ہے۔

بلاشبہ حضرت شیخ مذکور اپنے دور کے سب سے بڑے شیخ الحدیث، جیّد عالم و فاضل وسیع النظر فقیہ، مستند مورّخ و سیرت نگار، تذکرہ نویس، نکتہ داں، مفسّر اور بے مثال ادیب، شاعر اور نقّاد گزرے ہیں جن کی دینی، علمی، ادبی خدمات کو کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی

حضرت مولانا شاہ ولی اللہ محدّث دہلوی کے والد ماجد کا اسم گرامی شاہ مولانا عبدالرحیم تھا انھوں نے مقام مہندیان میں، جہاں آج کل اُن کے خاندانی افراد و بزرگوں کے مزارات ہیں ۱۱۱۲ھ میں اسی جگہ ایک دینی درسگاہ قائم کی تھی۔ اس درسگاہ نے اپنے دور میں نہایت مقبول و معروف، متّقی و پرہیزگار جیّد عالم و فاضل پیدا کیے جن میں حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز پانی پتی، حضرت مولانا شاہ عبدالقادر، حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ، حضرت مولانا محمد اسحاق، حضرت مولانا شاہ محمد عاشق، حضرت مولانا شاہ اسماعیل اور حضرت شاہ خواجہ محمد امین وغیرہ کے اسمار گرامی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ جو فارغ التحصیل ہونے کے بعد کافی طویل عرصہ تک اسی درسگاہ میں مسند درس پر بھی متمکن رہے۔

حضرت مولانا شاہ ولی اللہ اپنے دور کے نہایت متّقی پرہیزگار، دیندار و خداپرست اور صوفی صفت جیّد عالم و فاضل تھے۔ درس و تدریس آپ کی زندگی کا بہترین اور دلچسپ مشغلہ تھا۔ ۱۱۴۳ھ مطابق ۱۷۳۱ء کو آپ ج بیت اللہ شریف کے لیے تشریف لے گئے اور وہاں سے دو سال تین ماہ بعد ۹ر جولائی ۱۷۳۳ء کو اپنے آبائی وطن دہلی واپس پہنچے اور چند دن آرام کرنے کے بعد طلبار کو حدیث شریف و تفسیر و فقہ کا درس دینا پھر شروع کر دیا، آپ نے علم حدیث و تفسیر وغیرہ کو اپنے انفرادی و امتیازی

انداز بیان اور سلاست زبان سے بھی فروغ دیا اور تحریر و تصانیف کے ذریعے بھی، طلباء کو سمجھانے اور حقیقی مقصود ان کے ذہن نشین کرنے کے لیے ایسی عام فہم اور سلیس و سادہ زبان اور موثر انداز بیان اختیار فرماتے تھے کہ تمام تلامذہ بآسانی مطمئن ہو جاتے۔ آپ کی درسگاہ جو آپ کے والد بزرگوار نے قائم فرمائی تھی اُنھیں کے نام سے منسوب تھی اور درسگاہ رحیمیہ کہلاتی تھی، یہ درسگاہ دینی علوم حدیث اور تفسیر کا مخزن اور فقہ حنفی کا سرچشمہ اور زبان و ادب کی سلاست و روانی کا منبع تھی۔ حج بیت اللہ شریف سے واپسی پر حضرت نے تبلیغ دین اور اصلاح ملت کے لیے ایک جامع منصوبہ مرتب فرمایا اور پورے ہندوستان میں اس کی خاطر خواہ کامیابی و فروغ کے لیے سرگرم جدوجہد بھی فرمائی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ تصنیف و تالیف کا کام بھی تیز کر دیا۔ درسگاہ کے لیے جدید مفید و موثر تعلیمی نصاب تجویز فرمایا۔ اور تصنیف و تالیف کا بہت کام کیا۔

حق تو یہ ہے کہ صرف شاہ صاحب نے ہی نہیں بلکہ ان کے پورے خاندان نے ہی اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی اور فروغ و اشاعت کے لیے نمایاں اور قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔ شاہ صاحب کے لائق و فائق فرزند ارجمند حضرت شاہ رفیع الدین وہ پہلی منفرد و ممتاز شخصیت ہیں جنھوں نے سب سے پہلے قرآن مجید کا اردو ترجمہ کرکے وقت و ماحول کی اہم ضرورت کے تقاضے کی تکمیل فرمائی۔ اور پھر کچھ عرصہ بعد ان کے برادر خورد حضرت شاہ عبدالقادر نے ایک دوسرا ترجمہ کلام اللہ شریف کا نہایت سلیس و عام فہم زبان میں کیا اور ایک تفسیر بھی بعنوان موضح القرآن تحریر فرمائی۔ شاہ عبدالقادر صاحب کا ترجمہ کلام پاک نہایت سلیس، بامحاورہ اور عام فہم زبان میں ہے اور مذکورہ اردو ترجمہ آج بھی اپنی سلاست وزبان وبیان کی خوبیوں کی بنا پر اہل ایمان میں مقبولِ خاص و عام ہے اسی طرح آپ کے دیگر خاندانی افراد نے بھی اردو کی خدمات انجام دی ہیں جنھیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ غرض شاہ ولی اللہ صاحب کے خاندان کے فیض تعلیم و تربیت

اور تصانیف و تالیف نے اردو کی ترویج و ترقی میں نمایاں کردار ادا کیا اور اردو کے عام فہم، دلچسپ، صاف ستھرے اور سلیس لٹریچر کے ذریعہ وقت کی عوام میں اردو کو فروغ دینے میں بھرپور حق ادا کیا ہے۔ شاہ صاحب کے پوتے حضرت اسماعیل شہید جو اپنے دور کے جیّد عالم و فاضل اور اہلِ قلم گزرے ہیں انھوں نے متعدد دینی و تبلیغی رسائل تصنیف فرمائے جن میں۔ رسالۂ توحید، صراطِ مستقیم، تنویر المومنین اور تقویت الایمان وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر اور معروف ہیں۔

حضرت خواجہ میر دردؔ دہلوی

یہ بات گزشتہ اوراق میں واضح طور پر کہی جا چکی ہے کہ اردو کی تخم ریزی اور ابتدائی نشو و نما میں ہندوستان کے مختلف گوشوں کے صوفیاء و مشائخین کرام کا نہایت اہم اور قابل قدر کردار رہا ہے۔ انھوں نے اردو زبان و ادب کی نشو و نما اور ترویج و ترقی کے لیے صوفیانہ روایات کے پہلو بہ پہلو سرگرم جد و جہد کی۔ اردو کی ابتدائی تاریخ ہندوستان کے مشترکہ تہذیب و تمدن اور قومی اتحاد و یک جہتی کی آئینہ دار ہے اور اس میں ہماری رنگارنگ قدیم سیاسی، سماجی، معاشی مذہبی، معاشرتی اور ثقافتی وغیرہ وغیرہ جملہ اقدار کا نچوڑ شامل ہے۔

حضرت خواجہ میر دردؔ نے ۱۷۱۹ء مطابق ۱۱۳۳ھ میں اس وقت دلّی کے ایک درویش خاندان میں جنم لیا جب کہ دلّی بیرونی حملہ آوروں کی تباہ کاریوں کا نشانہ بنی ہوئی تھی۔ آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی خواجہ محمد ناصر اور عندلیبؔ تخلّص تھا۔ ان کا خاندان صدیوں سے بزرگی و استغنا اور فقر و درویشی کے لیے مشہور تھا۔ خواجہ ناصر عندلیبؔ اپنے عہد کے مشہور صوفی بزرگ تھے۔ آپ کی خانقاہ مرجعِ خلائق اور صوفی ازم و رشد و ہدایت کا مرکز تھی۔ اس وقت بیرونی حملہ آوروں کی سرگرمیوں اور ہنگامہ خیزیوں کے سبب دلی کے عوام سخت آزمائش اور صبر آزما دور سے گزر رہے تھے۔ مثل مشہور ہے کہ جب کوئی مصیبت آتی ہے تو اللہ تعالیٰ کی یاد بھی زیادہ آتی ہے۔ چنانچہ اُس

پُرآشوب انقلابی دور میں تصوف کے رجحان کو عوام النّاس میں نسبتاً زیادہ فروغ حاصل ہوا۔ وہ روحانی اقدار و اعمال جنھیں مسلمان پرامن دور میں اپنے عیش و عشرت اور خوش حالی و فارغ البالی میں گم ہو کر قطعی نظرانداز یا فراموش کر چکے تھے وہ اب پھر قلب و روح پر آشکارا ہونے لگیں اور اِس پرآشوب انقلابی و آزمائشی دورتے دلّی کے مسلمانوں کو خصوصاً تصوف ہی کی روحانی تعلیم و تربیت میں اپنی نجات اور عافیت کی راہ نظر آئی اور اس کے نتیجہ میں ہی صوفی ازم کی تحریک کو فروغ ہوا۔

چونکہ حضرت خواجہ میر دردؔ نے آنکھ ہی صوفیانہ ماحول میں کھولی تھی اور ہوش و فرد کی دنیا میں قدم رکھتے ہی علم دین و تصوف کے حصول کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔ اور صوفیانہ مزاج و طبع اور تصوف کا رجحان تو پہلے ہی ورثہ میں پایا تھا، پھر خداداد صلاحیتوں کے حامل تھے۔ یہی وجہ تھی کہ آپؒ نے ”اسرار الصلوٰۃ“ پندرہ برس کی قلیل عمر ہی میں حالت اعتکاف میں رقم کر لی۔ دنیاوی امور و معاملات سے آپ کو کوئی دل چسپی نہ تھی۔ تارک الدنیا ہو گئے تھے ۲۹ برس کی عمر میں خرقۂ درویشی زیب تن کر لیا تھا اور فقر و قناعت کی زندگی اختیار کر لی تھی۔

خواجہ دردؔ کے والد بزرگوار خواجہ محمد ناصر عندلیب کے کلام میں صوفیانہ رنگ بہت واضح اور نمایاں تھا چنانچہ دردؔ کے کلام میں بھی وہی سوز و گداز، وہی صوفیانہ رنگ اور عشق حقیقی کی عکاسی صاف جھلکتی ہے۔ اس وقت دردؔ اپنی عمر رواں کی بائیسویں ۲۲ منزل میں گامزن تھے کہ ان کے والد ماجد نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور اپنے فرزند ارجمند میر دردؔ کے لیے تصوّف اور شاعری ترکہ میں چھوڑ گئے۔ والد ماجد کے وصال کے بعد دردؔ سجادہ نشین ہوئے اور اپنی تمام زندگی درویشانہ، صوفی ازم کی تبلیغ و اشاعت اور رشد و ہدایت کے لیے وقف کر دی۔ دردؔ کے عقیدت مندوں کا حلقہ وسیع تر ہو گیا۔ ان کی خانقاہ میں ہمہ وقت اہل اللہ، درویشوں، عقیدت مندوں اور حاجت مندوں کا ہجوم رہتا تھا وہ ہر ایک کے دکھ درد میں کام آتے ہیں ایک گونہ قلبی سکون اور روحانی مسرت محسوس کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ بلا امتیاز

عوام وخواص سبھی حلقوں اور طبقوں کے لوگ آپ کی دل سے عزت اور قدر کرتے تھے۔ ہر ماہ کی پندرہ تاریخ کو اپنے کاشانہ پر مشاعرہ کراتے تھے جس میں دلی کے منتخب نعت و مناقب گو اور تصوّف پسند شعرا اور ارباب ذوق و عقیدت مند سامعین کو دعوت شرکت دی جاتی تھی۔ شریک ہونے والے شعرائے وقت اپنے اپنے کلام میں زبان وبیان کی لطافت و پاکیزگی ادبی بناؤ سنگار، سلاست و روانی، معیار مضمون کی بلندی ادائیگیِ مقصد میں نفاست و نزاکت وغیرہ وغیرہ جملہ فنکارانہ محاسن پر خاص توجہ دیتے تھے اور اپنے ہم عصروں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کے لیے خوب تیاریاں کرکے مشاعرہ گاہ میں اپنے اپنے جوہر دکھا کر داد و تحسین کے مستحق ہوتے تھے۔ اِن مشاعروں کے انعقاد سے جہاں ایک طرف اردو زبان وادب کو فروغ حاصل ہوا وہیں ارباب ذوق، سخن سنجوں اور سخن فہموں کی تعداد میں بھی روز بروز اضافہ کے ساتھ ساتھ صوفی ازم کی تحریک کو بھی فروغ ملا۔ صوفیانہ حیثیت سے دردؔ کی شخصیت متعلقہ صوفی پسند حلقوں اور تصوف کے شیدائیوں تک ہی مسلّم ومقبول تھی لیکن دردؔ کو ان کی اردو شاعری نے بلا امتیاز ہمہ گیر شہرت کا حامل بنا دیا۔ اگرچہ فارسی داں طبقوں میں آپ کا فارسی کلام پہلے ہی آپ کو شرف قبولیت دے چکا تھا۔ مگر چونکہ مغل سلطنتوں کا شیرازہ منتشر ہونے کے بعد فارسی کا بتدریج زوال شروع گیا تھا۔ اور دردؔ کے عہد میں اردو پسندوں کی تعداد بہ نسبت فارسی دانوں کے زیادہ ہو گئی تھی۔ پھر دردؔ کے اردو کلام میں وقت اور ماحول کے تقاضوں کے عین مطابق جذبات واحساسات کی عکاسی بھی تھی، سادگی و پرکاری بھی تھی زبان وبیان میں لطافت و پاکیزگی اور سلاست وروانی بھی تھی اور اسلوب بیان کا ایک انفرادی اور امتیازی انداز بھی۔ بس ان تمام خوبیوں نے دردؔ کو ایک باکمال صوفی و درویش شاعر کی حیثیت سے ملک کے ہر طبقہ کے عوام وخواص میں ہمہ گیر شہرت دی۔ انھوں نے اپنے بنیادی مقصد تصوف کی تعلیم کے پہلو بہ پہلو اردو کی جو گرانقدر ابتدائی خدمات انجام دیں اُنھیں ہرگز فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

خواجہ میر دردؔ صوفیِ کامل تھے وہ تصوف کے تمام مراحل ومنازل سے بخوبی واقف تھے ان کی تمام اردو اور فارسی شاعری میں تصوف ومعرفت کا ایک بحر بیکراں موجیں مارتا محسوس ہوتا ہے۔ ان کے اشعار میں آمد پائی جاتی ہے **آورد** نہیں، ان کے رنگ تصوف کی اصطلاحوں میں جدّت و پرکاری ہے اور مطالعہ سے ایک خاص پرکیف تاثر پیدا ہوتا ہے جو روح میں بالیدگی ایمان میں تازگی پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ دل ودماغ کے سمجھنے اور سوچنے کی صلاحیت وقوت کو بھی وسعت دیتا ہے۔ اردو شعری مجموعۂ کلام کے علاوہ آپ کی کئی تصانیف نثر میں بھی ہیں جن کے نام ”واردات دردؔ“۔ ”نالۂ دردؔ“ اور ”درد دل“ وغیرہ ہیں نمونۂ کلام ملاحظہ ہو ؎

رباعیات دردؔ

جب سے توحید کا سبق پڑھتا ہوں   ہر حرف پہ کتنے ہی ورق پڑھتا ہوں
اس علم کی انتہا سمجھنا آگے   اے دردا ابھی تو نام حق پڑھتا ہوں

جلوہ تو ہر اک طرح کا ہر شان میں دیکھا   جو کچھ کہ سنا تجھ میں سو انسان میں دیکھا
جوں غنچہ بجز اک دلِ صد چاک نہ پایا   منہ ڈال کے جب اپنے گریبان میں دیکھا

دل میں رہتے ہو پر آنکھوں دیکھنا مقدور نئیں   گھر سے دروازے تلک آؤ تو چنداں دور نئیں
چاہیئے دونوں جہاں جل جاویں اک شعلہ کے ساتھ   دردؔ ایسی سرد آہیں عشق میں منظور نئیں

ہر بُت کے لیے کب تئیں مرتے رہیئے   کب تک یہ کفر دل میں بھرتے رہیئے
اب دردؔ جو کچھ کہ زندگی باقی ہے   اللہ کو اپنے یاد کرتے رہیئے

گر معرفت کا چشمِ بصیرت میں نور ہے   تو جس طرف کو دیکھے اسی کا ظہور ہے
آتی ہے دل میں اور ہی صورت نظر مجھے   شاید یہ آئینہ بھی کسی کے حضور ہے

ارض و سماں کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے وہ کہ جہاں تو سما سکے
قاصد نہیں یہ کام ترا اپنی راہ لے
اس کا پیام دل کے سوا کون لا سکے

ہم تجھ سے کس ہوس کی فلک جستجو کریں
دل ہی نہیں رہا ہے جو کچھ آرزو کریں
ہر چند آئینہ ہوں پر اتنا ہوں ناقبول
منہ پھیر لے وہ جس کے مجھے روبرو کریں

تہمتیں چند اپنے ذمّے دھر چلے
جس لیے آئے تھے ہم سو کر چلے
شمع کے مانند ہم اس بزم میں
چشمِ نم آئے تھے دامن تر چلے

تجھی کو جو یاں جلوہ فرما نہ دیکھا
برابر ہے دنیا کو دیکھا نہ دیکھا
جوابِ رخ یار تھے آپ ہی ہم
کھلی آنکھ جب کوئی پردا نہ دیکھا

خواجہ دردؔ نے اردو رباعیات کی صنف میں تصوّف و معرفت کے خیالات اور مضامین کو اپنے منفرد انداز میں سموکر نہ صرف رباعی کے اسلوب کو ایک نیا موڑ دیا بلکہ رباعی کے میدان کو وسیع تر بنانے کے لیے جو جدید راہ ہموار کی اس کے لیے بے شک وہ قابلِ ستائش بھی ہیں اور محسن کہے جانے کے بجا طور پر مستحق بھی۔

دردؔ کی غزلیہ شاعری کا بھی سرسری جائزہ لیجیے آپ کی غزلیات میں بھی توحید اور تصوّف کے جذبات و احساسات کی مقدار و آمیزش بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ ابتدا سے ہی تصوّف اُن کی زندگی کا جزو لازم بن چکا تھا اور وہ بادۂ عشقِ حقیقی سے سرشار تھے۔ جیساکہ ان کے درج ذیل چند اشعار سے بھی واضح ہے، جو انھوں نے عشق حقیقی کے تعلق سے کہے ہیں ؎

کچھ حقیقت نہ پوچھ کیا ہے عشق   حق اگر سمجھو تو خدا ہے عشق
عشق ہی عشق ہے نہیں ہے کچھ   عشق بن تم کہو کہیں ہے کچھ
عشق حق ہے کہیں، نبی ہے کہیں   ہے محمدؐ کہیں، علیؓ ہے کہیں
عشق حاضر ہے عشق غائب ہے
عشق ہی مظہر العجائب ہے

دردؔ نے غزل کی صنف میں بھی اپنا ایک الگ اور اچھوتا اسلوب اپنایا اور وقت کی روایتی غزلیہ شاعری کے انداز سے الگ ہٹ کر اپنے مزاج و طبع کے مطابق تصوّف کی راہ غزل کے لیے بھی متعین کی۔ چند غزلیات کے منتخب اشعار بھی بطور نمونہ ملاحظہ ہوں ؎

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے   ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے
جوں شرر اے ہستیِ بے بود یاں   بارے ہم بھی اپنی باری بھر چلے

ساقیا یاں لگ رہا ہے چل چلاؤ   جب تلک بس چل سکے ساغر چلے
درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

گھر تو دونوں پاس ہیں لیکن ملاقاتیں کہاں   آمد و رفت آدمی کی ہے پہ وہ باتیں کہاں
ہم فقیروں کی طرف بھی تو نگاہ دمبدم   پھینکتے جاتے تھے آپ آگے وہ خیراتیں کہاں
صورتوں میں خوب ہوں گی شیخ گو حورِ بہشت   پر کہاں یہ شوخیاں، یہ طور یہ محبوبیاں
جس طرح سے کھیلتا ہے وہ دلوں کا یاں شکار
درد آتی ہیں کسی دلبر کو وہ گھاتیں کہاں

اندازہ وہ ہی سمجھے مرے دل کی آہ کا   زخمی جو کوئی ہوا ہو کسی کی نگاہ کا
لے کر ازل سے تا بہ ابد ایک آن ہے   گر درمیاں حساب نہ ہو سال و ماہ کا
رحمت قدم نہ رنجہ کرے گر تری اِدھر   یا رب ہے کون پھر تو ہمارے گناہ کا
دل اس مژہ سے رکھیو نہ تو چشم راستی   اے بے خبر بُرا ہے یہ فرقہ سیاہ کا
شاہ و گدا سے اپنے تئیں کام کچھ نہیں   نے تاج کی ہوس نہ ارادہ کلاہ کا
زاہد کو ہم نے دیکھ لیا جو نگیں بہ عکس   روشن ہوا ہے نام تو اس روسیاہ کا
اے درد چھوڑتا ہی نہیں مجھ کو جذبِ عشق
کچھ کہربا سے بس نہ چلے برگِ کاہ کا

کیا فرق داغ و گل میں کہ جس گل میں تو نہ ہو
کس کام کا وہ دل ہے کہ جس دل میں تو نہ ہو
جو کچھ کہ ہم نے کی ہے تمنّا ملی مگر
یہ آرزو رہی ہے کہ کچھ آرزو نہ ہو

جوں شمع جمع ہوویں گر اہل زباں ہزار
آپس میں چاہیئے کہ کبھو گفتگو نہ ہو
اے دردؔ زنگ صورت اگر اس میں جا گرے
اہلِ صفا میں آئینۂ دل کو رو نہ ہو

حضرت خواجہ میر آثرؔ دہلوی

آپ کا اسم گرامی سید محمد میر تھا اور آثرؔ تخلّص فرماتے تھے۔ اپنے دور کے مشہور و معروف صوفی، متقی و پرہیزگار بزرگ حضرت خواجہ میر دردؔ دہلوی کے آپ برادر خورد تھے۔ تصوّف اور روحانیت کے صاف و شفاف پاکیزہ ماحول میں پروان چڑھے۔ ہوش سنبھالتے ہی تحصیل علم کی طرف رجوع ہو گئے، فطری طور پر ذہین، علم کے شوقین اور خداداد صلاحیت کے حامل واقع ہوئے تھے علم دین اور تصوّف کی تعلیم نے قلب و روح کو مزید مجلّا کر دیا۔ اور آپ نے بہت جلد روحانیت، تصوّف، موسیقی، علم ریاضی، شعر و سخن وغیرہ علوم و فنون میں کم عمری ہی میں وہ کمال حاصل کر لیا کہ ہم عصروں میں آپ کا جواب نہ تھا۔ ابتدا سے ہی آپ اپنے برادر محترم صوفی بزرگ حضرت خواجہ میر دردؔؒ کے نقوش قدم پر گامزن تھے۔ اور ان کے وصال کے بعد آپ ہی آبائی منصب سجادہ پر مسند نشین ہوئے۔ اور تاحیات تبلیغ دین حق اور صوفی ازم کے فروغ میں سرگرم عمل رہے۔ شعر و سخن میں بھی انداز بیان اور رنگِ کلام و خیالات کے لحاظ سے کافی حد تک اپنے برادر محترم حضرت دردؔ سے مشابہت رکھتے تھے۔ کلام میں سلاست و روانی، سادگی و پرکاری اور تصوّف کی چاشنی نمایاں تھی۔ آپ کا تمام کلام عشق حقیقی کے سوز و گداز اور حسنِ حقیقی کی ریزیوں سے مرصع ہے۔ تاثرات و احساسات کی ادائیگی کا انداز بیان اس قدر سلیس اور

سادہ جیسے کوئی باتیں کر رہا ہو۔ زبان ایسی نرم و شیریں اور لطیف و پاکیزہ کہ اپنے قاری یا سامع کے دل و دماغ کو فوراً متاثر کرے۔

مجموعۂ کلام کے علاوہ آپ نے مثنوی "خواب و خیال" بھی لکھی جو بے مثال اور لاجواب تصنیف ہے اور اردو زبان و ادب کے ذخیرہ میں ایک گرانقدر اضافہ کی موجب بھی۔

نمونہ کے طور پر آپ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

یاں تغافل میں اپنا کام ہوا　　تیرے نزدیک یہ جفا ہی نہیں

دوست ہوتا جو وہ تو کیا ہوتا　　دشمنی پر تو پیار آتا ہے

کبھی دوستی ہے کبھی دشمنی　　تری کون سی بات پر جائیے

چھپ کے دیکھنے کے مزے سب پہ اے آثرؔ
معلوم ہوں گے جو کبھی اس نے نگاہ کی

دیگر

جوں گُل تو ہنسے ہے کھل کھلا کر　　شبنم کی طرح مجھے رُلا کر
مہماں ہو یا کہ یاں تو آکر　　یا رکھ مجھے اپنے ہاں بلا کر
در پر ترے ہم نے خاک چھانی　　نقد دل خاک میں ملا کر
مانوس نہ تھا وہ بت کسو سے　　ٹک رام کیا خدا خدا کر
کن نے کہا اور سے نہ مل تو　　پر ہم سے بھی کبھو ملا کر
گو زیست سے ہیں ہم آپ بیزار　　اتنا بہ نہ جان سے خفا کر
کچھ بے اثروں کو بھی اثر ہو
اتنی تو بھلا آثرؔ دُعا کر

دیگر

روز اٹھ کر نیا بہانا ہے　　کام تیرا غرض بہانا ہے

راہ تکتے ہی تکتے ہم تو چلے   آئیے بھی کہیں جو آنا ہے
وعدے کر انتظار میں رکھنا   نت نئی طرح کا ستانا ہے
دل گیا جی بھی اب ٹھکانے لگا   تس پہ بھی باقی آزمانا ہے
ہر طرف توڑ جوڑ کرتے ہو   دلبری ایک کارخانا ہے
تیری عیّاریوں کی باتیں آثرؔ
سب سمجھتا ہے گو دِوانا ہے

حضرت خواجہ محمد نصیر دہلویؒ

حضرت خواجہ محمد نصیرؒ ۱۱۸۹ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ آپ حضرت خواجہ شیخ میر دردؔ دہلوی کے نواسے تھے۔ حضرت دردؔ اپنے دور کے مشہور و معروف صوفی بزرگ اور فارسی اور اردو کے مقبول ترین شاعر تھے۔ حضرت خواجہ محمد نصیرؒ بچپن سے ہی، جب سے ہوش سنبھالا اپنے نانا جان (حضرت دردؔ) کی خدمت میں رہے۔ اور پاکیزہ صوفیانہ و درویشانہ ماحول میں پروان چڑھے۔ بہت ذہین اور تحصیل علم دین کے شوقین اور طالب خدا واقع ہوئے تھے۔ اپنے نانا جان سے بیعت بھی تھے ان کے کردار و عمل پر ہمہ وقت خاص توجہ اور دھیان دیتے تھے اور ان کی ہر بات اپنی گرہ میں مضبوطی سے باندھ لیتے تھے۔ تحصیل علم دین کا سلسلہ جاری تھا کہ ۱۱۹۹ھ میں جب کہ آپ عمر رواں کی دس منزلیں طے کر کے گیارہویں منزل میں گامزن ہو رہے تھے کہ نانا جان کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور آپ کو داغ مفارقت نصیب ہوا۔ آپ کو اپنے پیر و مرشد (نانا جان) کی جدائی بہت شاق گزری ان کی رحلت کے بعد آپؒ بہت دل شکستہ اور رنجور رہا کرتے تھے۔ لیکن نانا مرحوم و مغفور کی ہدایت کے بموجب تحصیل علم کی سرگرمیوں میں کوئی کمی اور کوتاہی نہیں برتی اور امتیازی شان سے فارغ التحصیل ہوئے۔

علم ریاضیات اور علم موسیقی میں لاجواب مہارت اور کمال حاصل کیا۔ مسائل

حساب میں وہ مہارت بہم پہنچائی کہ مسائل لاینحل چٹکیوں میں حل فرما دیتے تھے۔ موسیقی کی تال اور لے سے اس قدر واقف اور مشاق تھے کہ وقت کے بڑے بڑے استاد اور مشہور فنکار بھی ان کے سامنے گھٹنے ٹیک دیتے تھے۔ علم ریاضیات اور فن موسیقی کے تعلق سے آپ کی گرانقدر تصانیف کے رسائل موجود ہیں جو نہایت جامع واضح اور فصیح ہیں۔ اور اہل ذوق آج تک آپ کے بیان کیے رموز و نکات سے مستفیض ہو رہے ہیں۔

بہر کیف یہ تو حضرت موصوف کی ظاہری صفات و خدمات تھیں لیکن باطنی کمالات میں بھی آپ کا مقام و مرتبہ بہت بلند تھا۔ باطنی کمالات حضرت میر اثر دہلوی سے جو حضرت خواجہ میر دردؒ یعنی آپ کے ناناجان کے برادر خورد تھے حاصل کیے تھے حضرت میر اثر اپنے برادر محترم حضرت درد کے وصال کے بعد ان کے سجادہ نشین ہوئے اور حضرت میر اثر کی وفات کے بعد حضرت درد کے فرزند ارجمند حضرت خواجہ میر جانشین ہوئے اور ان کے وصال کے بعد حضرت خواجہ محمد نصیرؒ نے مسند جانشینی کو زینت بخشی۔ آپ کے دورِ سجادگی میں ہر ماہ کی دوسری اور چوبیسویں قمری تاریخوں کو مجلس بین نوازی آپ کے روبرو منعقد ہوا کرتی تھی۔ ذکر رسول پاکؐ کی محافل روحانی بھی بڑے اہتمام سے منعقد ہوتی تھیں۔ محفل وعظ و پند بھی۔ غرض آپ کا بنیادی مقصد و مطمح نظر اپنی سرگرمیوں سے فروغ دین رہا ہو یا صوفی ازم کا فروغ یا محض اپنے جذبہ کی تسکین بہرحال یہ ماننا پڑے گا کہ ان کی سرگرمیوں اور عملی جد و جہد سے یعنی تحریر و تقریر، فن موسیقی، علم ریاضی وغیرہ کے ذریعہ اردو زبان و ادب کو ترقی میں تعاون ضرور ملا۔ اور اس حیثیت سے آپ کو اردو زبان و ادب کا ایک خادم کہنا غلط نہ ہوگا۔

مرزا مظہر جان جاناںؒ

مرزا مظہر جان جاناں اپنے دور کے مشہور صوفی بزرگ گزرے ہیں آپ حضرت خواجہ میر دردؒ کے ہم عصر تھے۔ آپ کا اسم گرامی جان جاناں، مظہر تخلص اور شمس الدین حبیب اللہ لقب تھا، علوی نسب اور حنفی مذہب، مرزا صاحب کا سلسلۂ نسب خود اُن کے بیان کے مطابق اٹھائیس واسطوں سے حضرت بن حنفیہ کے توسط سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ تک پہنچتا ہے۔ آپ کے دادا محترم مرزا میر عبدالسبحانؒ خاندان چشتیہ میں مُرید تھے اور آپ کی دادی محترمہ حضرت شاہ عبدالرحمٰن قادری سے بیعت تھیں۔ یہ دونوں بزرگ و برگزیدہ ہستیاں ترک علائق کر کے اور خرقۂ درویشی زیب تن کر کے مصروف عبادات و مجاہدات ہو گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان نفوس قدسیہ سے جو اولاد تولد ہوئی ہوگی اس کا مرتبہ کتنا بلند و بالا ہوگا۔ چنانچہ مظہر جان جاناںؒ کے والد گرامی جناب مرزا جان بھی نہایت متقی و پرہیزگار صوفی ہوئے اور والدہ محترمہ بھی روشن ضمیر و خداپرست تھیں۔ اس طور سے گویا انوار الٰہی کی فراوانیاں آپ کو وراثت ہی میں ملیں۔ اور آپ طریقت و تصوّف کے افق پر مہ کامل بن کر جگمگائے۔ آپ کے والد مرزا جان شہنشاہ وقت عالمگیر اورنگ زیب کے دربار میں منصب قضا پر مامور تھے مگر چونکہ ابتدا سے ہی صوفیانہ مزاج و جذبات لے کر پیدا ہوئے تھے۔ درویش طبع، حساس اور عشقِ حقیقی سے لبریز دل رکھتے تھے اس لیے ملازمانہ زندگی کے

فرائض کی ادائیگی اور منصب کی پابندیاں زیادہ دیر گوارا اور برداشت نہ کر سکے اور مستعفی ہو گئے۔

مرزا مظہر جان جاناںؒ کے سنہ ولادت میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے لیکن عام طور پر تذکروں میں ۱۱۱۱ھ درج ہے۔ اور محققین میں اسی پر زیادہ اتفاق پایا جاتا ہے۔ جان جاناں نے خالص صوفیانہ ماحول میں آنکھ کھولی اور پروان چڑھے۔ فطری طور پر بہت ذہین اور خداداد صلاحیت کے حامل تھے جب ہوش سنبھالا اور مکتب میں بٹھائے گئے تو اپنی ذہنی صلاحیت و کمالات سے اپنے معلّم کو حیرت میں ڈال دیا۔ پھر درسگاہ میں داخل ہوئے تو اپنے اتالیق علماء و فضلاء کو بھی حیران بنا دیا وہ آپ کے ذوقِ حصول علم اور شوق و ذہانت سے بے انتہا متاثر ہوئے اور انگشت بدنداں رہ گئے۔

مرزا صاحب نے رسائل محاورۂ فارسی خود اپنے والد بزرگوار سے پڑھے اور معقول و منقول کی کتب کئی علمائے وقت سے پڑھیں۔ کلام اللہ شریف قاری عبدالرسول دہلوی سے پڑھا، علم تجوید و قرأت کی سند بھی انھیں سے حاصل کی، علم حدیث شریف اور تفسیر اور دیگر مبسوط کتب حضرت حاجی محمد افضل سیالکوٹی سے پڑھیں۔ ابھی اپنی عمر رواں کی پندرھویں منزل ہی میں گامزن تھے کہ صرف و نحو، تفسیر و حدیث، فقہ و معانی، تاریخ و سیر اور ریاضی و منطق وغیرہ کے علوم سے فارغ التحصیل اور کامل ہو چکے تھے۔ اور اب آپ کے قلب کی گہرائیوں میں علوم باطنی کے حصول کی چنگاریاں بھی شعلوں میں تبدیل ہو کر بھڑک چکی تھیں۔ بس ادھر سند فضیلت حاصل کی اور اُدھر علوم باطنی کے حصول کے لیے میدان عمل میں گامزن ہو گئے۔ ابھی سولھویں برس میں قدم رکھا تھا کہ والد ماجد مرزا جان کا سایہ سر سے اٹھ گیا اور یتیم ہو گئے۔ اس سانحہ کے بعد ایک دن اچانک گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور حضرت سید نور محمد بدایونی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے جو اُس وقت قطب وقت بھی تھے اور شہنشاہ عالم گیر اورنگ زیب کے پیرو شیخ محمد معصومؒ کے فرزند جلیل حضرت شیخ سیف الدین مجددیؒ

کے باکمال خلیفہ بھی، جن کے کشف وکرامات کا یہ عالم تھا کہ جس کی طرف بھی نگاہ لطف وکرم فرما دیتے وہ طالب مولیٰ اور عاشق ایزدی ہو جاتا تھا۔ بہرکیف جان جاناںؒ حضرت سیّد نور محمد بدایونیؒ مذکور سے بیعت ہو گئے اور کچھ مدت ان کی خدمت میں رہ کر خرقۂ خلافت حاصل کرنے کے بعد اپنے آبائی وطن دہلی واپس آکر خدمت خلق اور رشد و ہدایت کی عملی سرگرمیوں میں مصروف ہو گئے۔ درس وتدریس اور شعر وسخن آپ کی زندگی کا دلچسپ مشغلہ رہا۔

جان جاناںؒ نے فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شاعری کی اور اپنی خداداد ذہانت وصلاحیت اور صوفیانہ جذبۂ صادق سے گلستانِ شعروادب میں ایسے ایسے گل بوٹے کھلاتے جو خوش رنگ بھی ہیں اور مشام پرور بھی، جانِ نظارہ بھی ہیں اور روح کے لیے تازگی بخش بھی۔ رہی یہ بات کہ کس زبان میں اُن کے کلام کا ذخیرہ زیادہ ہے اور کس زبان میں کم یہ ایک الگ یات ہے لیکن یہ حقیقت اور صداقت اپنی جگہ مسلّم اور واضح ہے کہ مرزا جان جاناں نے اردو زبان میں، جسے ریختہ بھی کہتے تھے، شاعری کی ہے اور اُن کی تمام شاعری کی اساس تصوّف کے رجحانات وتخیل اور صوفی ازم کے خیالات اور رشد و ہدایت پر قائم ہے۔ ریختہ (اردو) سے انھیں بہت دلچسپی اور لگاؤ تھا۔ ان کے انداز بیان کی خوبی، سلاست اور روانی، مناسب و بہتر عام فہم اور شگفتہ الفاظ کا برمحل لطافت ونزاکت کے ساتھ استعمال وغیرہ وغیرہ کلام کی وہ خوبیاں ہیں جو اُن کی اردو زبان وادب سے خاص دل چسپی اور لگاؤ کی ضامن ہیں۔ سراج الدین علی خاں آرزوؔ کے ایک بیان کے مطابق بھی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ جان جاناںؒ کو اردو سے بہ نسبت رائج الوقت دیگر زبانوں کے زیادہ دلچسپی اور لگاؤ تھا۔ آرزوؔ کا کہنا ہے کہ مرزا جان جاناںؒ اپنے تلامذہ پر بہت توجہ فرماتے تھے۔ چونکہ وہ ایک مرشد وہادی اور صوفی تھے اور اُن کے وقت کا زیادہ تر حصّہ طالبانِ حق کی تعلیم وتربیت اور عبادت وریاضت پر بھی صرف ہوتا تھا اس لیے ظاہر ہے کہ وہ شعر وشاعری کے لیے زیادہ وقت

نہیں دے سکتے تھے۔ تاہم وہ جس قدر وقت بھی شعر و شاعری کے لیے نکال سکتے وہ ایسے ہی تلامذہ کی نذر کرتے تھے جو اُردو سے اور اردو زبان و ادب سے واقعی دلچسپی رکھتے تھے۔ بہرکیف وہ شعر و سخن کے لیے بھی کچھ نہ کچھ وقت اپنے تلامذہ کو ضرور دیتے تھے۔ اس دَور میں اردو شاعری کا ذوق اور چرچہ عام ہو رہا تھا اس لیے وقت کے نوجوان طبقہ کا اس صنف سے دلچسپی لینا ایک لازمی اور فطری امر بھی تھا۔ اس دور کو شاعری کے لیے اصلاح کا دور بھی کہا جاتا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اردو شاعری بازیچۂ الفاظ بن کر رہ گئی تھی صنعت ایہام کا رواج اپنی حد سے زیادہ تجاوز کر گیا تھا۔ لیکن مظہر جان جاناں اس دَور کے پہلے سخنور ہیں جنھیں اردو شاعری میں زبان و ادب میں اصلاح و فروغ کا احساس پیدا ہوا اور انھوں نے اردو شاعری سے ایہام کی صنعت کو ترک کرنے کی ممکن جد و جہد کی اور گلستانِ سخن میں از سر نو ایک تازگی، تخئیل میں حسن و نزاکت، انداز بیان میں سلاست و لطافت اور جدت و پُرکاری پیدا کرنے کی عملی کوشش شروع کر دی جس کے نتیجہ میں اُردو زبان و ادب میں ایک نئی تازگی۔ نفاست و لطافت اور شستگی و چُستی کے دور کا آغاز ہوا اور اس طرح مظہر جان جاناں اردو شاعری کے پہلے مصلح ہیں جنھوں نے اردو شاعری اور زبان و ادب کو ترقی کا نیا موڑ دیا، نئی راہ دکھائی اور اُردو شعر و ادب کو لطافت تخئیل اور اسلوب بیان کے اچھوتے اور تازہ بتازہ مشام پرور رنگا رنگ پھولوں سے آراستہ کیا، یہ آپ ہی کی جد و جہد اور کوشش کا نتیجہ ہوا کہ اردو میں برج بھاشا اور دکنی الفاظ کے استعمال میں بتدریج کمی واقع ہوئی اور بہت سے الفاظ کا اردو میں استعمال کرنا متروک قرار پایا۔ آپ نے اردو زبان و ادب کے بناؤ سنگار اور فروغ کے لیے جو کارنامے اور خدمات انجام دیں اُنھیں اردو شعر و ادب کی دنیا کا کوئی منصف مزاج حق پسند مورّخ کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔

مرزا صاحب کے ہم عصروں کے تذکروں کے مطابق ان کی وفات ۷ محرم الحرام ۱۱۹۵ھ شب چہار شنبہ کو ہوئی۔ نیز یہ کہ مرزا صاحب مذکورہ تاریخ و شب میں

شہید کیے گئے نیز یہ کہ تین نا معلوم اشخاص، جن میں ایک شخص کو تذکرہ نگاروں نے ایرانی نژاد مغل تحریر کیا ہے، نے طمنچہ سے مرزا صاحب پر ان کی قیام گاہ میں جاکر وار کر کے شہید کر دیا۔ گولی آپ کے دل کے قریب لگی اور جانبر نہ ہو سکے۔ قاتل فرار ہو گئے۔ واللہ اعلم۔

مرزا صاحب کا اردو کلام بطور نمونہ درج ذیل ہے

سحر اُس حُسن کے خورشید کوں جاکر جگا دینا
ظہور حق کوں دیکھا خوب دیکھا با ضیا دیکھا
نہیں پایا مرے رونے کوں اور فریاد کو بادل
برس دیکھا، جھڑی کو ماند دیکھا، کڑکڑا دیکھا
سجن کس کس مزہ سے آج دیکھا ہم طرف یارو
اشارہ کر کے دیکھا، ہنس کے دیکھا مسکرا دیکھا

ہوا ہوں بند اس کے غم میں اوس دن سوں
کہ وہ مجکوں نظر بھر بھر کے دیکھا دل جلا دیکھا
کبھی ملتا نہیں میرا ہٹیلا کیا کروں مظہرؔ
تصدق ہو کے دیکھا، پاؤں پڑ دیکھا مُنا دیکھا

گرچہ اسلوب نہ ہو سکے تو کچھ انصاف کرو — زندگی کیونکر کٹے ایسے ستمگار کے سات
ایک دم تھا سو بھی نہ رہا آیا ناک میں مظہرؔ — جی گیا، جان گیا، دم بھی چلا یار کے سات

گل کو جو گل کہوں تو ترے رُو کو کیا کہوں — دُر کو جو دُر کہوں تو اس آنسو کو کیا کہوں
مدّت سے اس خیال کے آیا ہوں پیچ میں — گر مو کہوں کمر کو تو گیسو کو کیا کہوں

رونے سے تجھ فراق کے آنکھیں مری گئیں   ڈوبا یہ خاندان اس آنسو کو کیا کہوں
کرتا ہے جور جو عوض اپنے ہی یار کے
مظہر ترے ستمگرِ بد خو کو کیا کہوں

تجلّی گر تری پست و بلندان کو نہ دکھلاتی   فلک یوں چرخ کیوں کھاتا زمیں کیوں فرش ہو جاتی
حنا تیرے کفِ پا گر نہ اس شوخی سے سہلاتی   یہ آنکھیں کیوں لہو روتیں انھوں کی نیند کیوں جاتی
اگر یہ سرد مہری تجکو آسائش نہ سکھلاتی   تو کیونکر آفتابِ حسن کی گرمی میں نیند آتی
الٰہی درد و غم کی سرزمیں کا حال کیا ہوتا
محبت گر ہماری چشمِ تر سے مینہ نہ برساتی

متفرق اشعار

رسوا اگر نہ کرنا تھا عالم میں یوں مجھے   ایسی نگاہِ ناز سے دیکھا تھا کیوں مجھے

کوئی تسبیح اور زنّار کے جھگڑے میں مت بولو   کہ آخر ایک ہیں آپس میں دونوں بیچ رشتا ہے

عزیزاں ایک لمحہ میں مرا جی اب نکلتا ہے   طبیبِ عشق کو کوئی شتابی سے بلا لاوے

خدا کو اب تجھے سونپا ارے دل   یہیں تک تھی ہماری زندگانی

لوگ کہتے ہیں مر گیا مظہؔر
فی الحقیقت میں گھر گیا مظہؔر

حضرت شاہ غلام علی دہلویؒ

حضرت مولانا شاہ غلام علی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ سادات علوی اور اولیائے کرام میں سے تھے۔ آپ کے والد ماجد حضرت مولانا شاہ عبداللطیف رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ، حضرت شاہ ناصر الدینؒ بخاری سے بیعت تھے. جن کا مزار پُر انوار محمد شاہی عیدگاہ کے عقب میں شیدی پورہ میں واقع ہے۔

حضرت شاہ غلام علی ۱۱۵۸ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے، صوفیانہ ماحول میں پروان چڑھے۔ ہوش و خرد کی منزل میں قدم رکھتے ہی اپنا تمام وقت تحصیل علم دین کی جدوجہد، عبادت الٰہی اور تبلیغ دین کے امور میں صرف کرنے لگے. علم کے فطرتاً شوقین اور خداداد صلاحیت کے حامل تھے آناً فاناً علم کی منازل عبور کرکے فارغ التحصیل ہوگئے۔

شاہ صاحب حضرت مظہر جان جاناں کے مشہور و نامور خلیفہ تھے۔ آپ کے اکثر ارباب عقیدت آپ کو سترھویں صدی کا مجدّد بھی کہتے تھے۔ آپ کی خانقاہ دہلی میں حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کے مدرسہ کے بالمقابل واقع تھی گویا ایک طرف ولی اللٰہی طریقہ کی میانہ روی اور علم و عرفان تھا، اور دوسری طرف مجدّدی شرف کا احیا ذوق اور تصوّف کی سرگرمی تھی اور اس کے ساتھ ہی درس اور تدریس کا سلسلہ بھی جاری تھا۔ شاہ صاحبؒ کی تمام زندگی تبلیغِ دین، صوفی ازم

کے فروغ اور درس وتدریس کے مشاغل میں بسر ہوئی۔ آپ کلام اللہ کے حافظ بھی تھے۔ آپ کی خانقاہ علم دین وادب کا مرکز تھی، حلقۂ تلامذہ وسیع تھا خالص فقیرانہ زندگی کے حامل تھے، بوریا نشین تھے۔ خانقاہ میں بوریا کا فرش بچھا رہتا تھا اور اُسی پر ایک گوشہ میں کھجور کے پتوں کی چٹائی یا بوریا کا ہی ایک مصلّیٰ بچھا رہتا تھا۔ درسِ حدیث وتفسیر، پند ونصائح، نوجوانان وقت کی اصلاح کے لیے تحریری اور تقریری جدوجہد، مراقبہ، شب بیداری، عبادت الٰہی اور تصوّف کے حقیقی معانی زبان وبیان سے سمجھانا وغیرہ وغیرہ آپ کی روز مرّہ زندگی کا دلچسپ مشغلہ تھا۔

ایک مدت تک حضرت کے فیض کا یہ باب کھُلا رہا اور وقت کے سینکڑوں شائقین علم وتشنگان معرفت اس چشمۂ خیر سے سیراب وفیضیاب ہوتے رہے۔ ۲۲ر صفر ۱۲۴۰ھ کو آپ نے داعیِ اجل کو لبیک کہا اور اپنے مرشد حضرت مظہر جانِ جاناں کے پہلو میں دفن کیے گئے۔

حضرت مفتی صدرالدین آزردہ دہلویؒ

حضرت مولانا مفتی صدرالدین آزردہ دہلوی ایک معزز و دیندار کشمیری خاندان کے نورِ نظر تھے جو کشمیر سے دہلی میں آکر مستقل آباد ہو گیا تھا۔ حضرت مفتی صاحب کے والد بزرگوار کا اسم گرامی شیخ لطف اللہؒ تھا۔ آزردہ صاحب ۱۲۰۴ھ مطابق ۱۷۷۹ء کو دارالسلطنت دہلی میں پیدا ہوئے۔ خالص دینی و صوفیانہ پاکیزہ ماحول میں پلے بڑھے۔ بچپن سے ہی علم حاصل کرنے کے شوقین تھے۔ فطرتاً بہت ذہین واقع ہوئے تھے۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ، شاہ رفیع الدینؒ، شاہ محمد اسحاقؒ اور مولانا فضل امام خیر آبادی جیسے وقت کے عظیم و بلند پایہ اساتذہ سے تعلیم پائی۔ فن خوشنویسی کے حصول کے لیے شہنشاہِ وقت بہادر شاہ ظفر سے فخر تلمّذ حاصل کیا۔ مفتیِ وقت اور صدرالصدور کے گرانقدر و اعلیٰ منصب پر بھی کچھ عرصہ فائز رہے۔ لیکن اس ملازمانہ زندگی کے باوجود بھی عبادتِ الٰہی کے بعد جو کچھ وقت ملتا وہ طلبا کو درس دینے اور حدیث بیان کرنے میں صرف کرتے۔ مدرسہ دارالبقا جو شاہجہاں کے دور میں ۱۰۶۰ھ میں تعمیر ہوا تھا حوادثات وقت اور انقلابِ زمانہ سے منہدم ہو چکا تھا۔ آزردہ صاحب نے از سر نو مرمّت یا تعمیر کرائی اور خود درس بھی دیا۔

حضرت مفتی صدرالدین آزردہ کی شخصیت وقت کے عوام و خواص سب ہی میں یکساں ہردلعزیز اور امتیازی حیثیت کی حامل تھی۔ ۱۸۵۷ء میں جو جہاد کا فتویٰ

جاری کیا گیا تھا اس فتوے پر بحیثیت مفتیِ وقت دہلی آپ کے بھی دستخط ثبت تھے۔ اور جس کے نتیجہ میں آپ کی گرفتاری بھی عمل میں آئی اور منصب سے بھی علیحدہ کردیے گئے۔

مفتی آزردہ صاحب کو عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں پر یکساں عبور اور قدرت حاصل تھی۔ آپ نے تینوں زبانوں میں مشق سخن بھی فرمائی اور اپنے کلام پر وقت کے معروف اساتذۂ سخن شاہ نصیر دہلوی، میر ممنون اور محرم اکبرآبادی سے اصلاح بھی لی اور شعر وادب کی دنیا میں ایک ممتاز و نمایاں مقام و مرتبہ حاصل کیا۔ آپ کے اکثر تلامذہ بھی مقبول و کامیاب ہوئے۔ درس و تدریس کا شغل زندگی کے آخری دم تک جاری رہا۔ نواب یوسف علی خاں ناظم والیِ ریاست رامپور اور نواب صدیق حسن خاں والیِ بھوپال اور سر سید احمد خاں کے بھی مفتی صاحب ایک عرصہ اتالیق رہے۔ ١٢٨٥ھ مطابق ١٨٦٨ء کو آپ نے اس دارِ فانی سے دارالبقا کو رحلت فرمائی۔

نمونۂ کلام

نمونہ کے طور پر آزردہ صاحب کے چند مختلف اردو اشعار اور ایک غزل ذیل میں درج ہیں آپ کا اندازِ بیان نہایت سادہ عام فہم اور زبان سلیس تھی۔

آزردہ ہونٹ تک نہ ہلے اس کے روبرو
مانا کہ آپ سا کوئی جادو بیاں نہیں
اس کی گلی میں لے گئے آزردہ کو اسے
دی تھی دعا یہ کس نے کہ جنت میں گھر ملے

غزل

نالوں سے میرے کب تہ و بالا جہاں نہیں
کب آسماں زمین و زمیں آسماں نہیں
مجھ سا بھی کوئی عشق میں ہے بدگماں نہیں
کیا رشک دیکھ کر مجھے رنگِ خزاں نہیں

جانے ہے دل فلک کا مری تلخ کامیاں   ان ناتوانیوں کو پہنچتی تواں نہیں
قاتل کی چشم تر نہ ہو یہ ضبطِ آہ دیکھ   جیوں شمع سر کٹے بہ اٹھایاں دھواں نہیں
آنکھوں سے دیکھ کر تجھے سب ماننا پڑا   کہتے تھے جو ہمیشہ چنیں ہے چناں نہیں
کہتا ہوں اس سے کچھ ہیں نکلتا ہے منہ سے کچھ   کہنے کو یوں تو ہے گی زباں پر زباں نہیں
اے بلبلانِ شعلہ دم اک نالہ اور بھی   گم کردہ راہِ باغ ہوں یاد آشیاں نہیں
اٹھ کر سحر کو سجدۂ مستانہ کے سوا   طاعت قبول خاطرِ پیرِ مغاں نہیں
جھکا ہوا ہے بیت حزن دیکھنا کوئی   آیا نسیم مصر کا ہو کارواں نہیں
افسردہ دل نہ ہو درِ رحمت نہیں ہے بند   کس دن کھلا ہوا درِ پیرِ مغاں نہیں
اے دل تمام نفع ہے سودائے عشق میں   اک جان کا زیاں ہے سو ایسا زیاں نہیں
اچھا ہوا نکل گئی جانِ حزیں کے ساتھ   اک قہر تھی بلا تھی قیامت تھی جاں نہیں

آزردہ نے پڑھی غزل اک میکدہ میں کل
وہ صاف تر کہ سینۂ پیرِ مغاں نہیں

حضرت شاہ ابوالخیر عبداللہ محی الدین خیرؔ فاروقی مجددی دہلویؒ

حضرت شاہ ابوالخیرؒ کی ولادت حسب تحریر مصنف "مقامات خیر" بروز یکشنبہ ۲ ربیع الآخر ۱۲۷۲ھ مطابق ۶ جنوری ۱۸۵۶ء خانقاہ شریف میں دلّی میں ہوئی۔ آپ کے والد کا اسم گرامی حضرت شاہ محمد عمر تھا۔ جو نہایت متقی پرہیزگار خداپرست عالم صوفی اور شاعر بھی تھے۔ آپ کی ولادت کے تعلق سے دو تاریخیں بھی کہیں۔ ایک اردو میں اور دوسری فارسی میں اردو تاریخ ولادت درج ذیل ہے۔

قطعہ تاریخ ولادت

خوب سی دنیا مبارکباد یاں   جب جگر گوشہ عمر صاحب کا ہو
اور کوئی پوچھے سنِ میلاد نو   "قرۃ العین" عمر صاحب کہو

۱۲۷۲ھ

ابھی آپؒ کی عمر پونے دو سال کی تھی کہ دلّی پر انگریزوں کا تصرّف ہوا اور اواخر محرم ۱۲۷۴ھ میں آپ نے اپنے جدامجد ابوین کریمین کی قیادت میں مع اہل خاندان خانقاہ شریف سے حجازِ مقدس کا سفر اختیار کیا۔ جب آپ کی عمر پورے چار سال ہوگئی تو آپ کے والد بزرگوار آپ کو لے کر جدامجد کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ آپ ان کو بیعت فرمالیں۔ جدامجد نے آپ کے نازک و پیارے ہاتھوں کو اپنے دستِ مبارک میں لے کر آپ سے بیعت کے مروّج الفاظ کہلوائے اور پھر دعائے خیر فرمائی

اور ہر وقت موجود حلقہ بگوش آمین ثم آمین کہتے رہے۔

حجاز مقدس کے پاکیزہ دینی ماحول میں آپ نے پرورش پائی۔ ہونہار اور خداداد صلاحیت کے حامل تھے، قوت حافظہ بھی قسام ازل نے بدرجۂ اتم ودیعت فرمائی تھی ہوش کی دنیا میں قدم رکھتے ہی علم دین کی طرف رجوع ہو گئے نو برس کی عمر میں ہی قرآن شریف حفظ کر لیا اور اس کے بعد کتب درسیہ کی تحصیل میں مشغول ہو گئے۔ اور آناً فاناً تحصیل علم کی منازل امتیازی شان سے طے کرنے لگے۔ اسی دوران ۱۲۷۷ھ میں آپ کے جدامجد نے مدینہ طیبہ میں داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

آپؒ نے علوم عقلیہ اور نقلیہ کی کتب کے درس مندرجہ ذیل لائق و فائق اساتذہ سے لیے۔

۱۔ حافظ عبدالقریر۔ ۲۔ قطب مکہ سید احمد دَہّان۔ ۲۔ شیخ الاسلام سید احمد دحُلان مفتی شافعیہ۔ ۴۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی موسس مدرسۂ صولتیہ۔ ۵۔ سرشار بادۂ عشق نبوی حضرت مولانا سیّد حبیب الرحمٰن ردولوی۔ ۶۔ عمِّ اصغر حضرت شاہ محمد مظہر۔ ۷۔ عمِّ پدر بزرگوار شاہ عبدالغنی مورث دارالہجرۃ۔ رسالہ سیرُ الکاملین میں مولانا محمد نواب کا اسم گرامی بھی آپ کے اساتذہ میں تحریر ہے۔ مولانا محمد نواب آپؒ کے جدامجد کے شاگرد اور مرید تھے اور طویل مدت ساتھ رہے اس لیے ممکن ہے کہ مدینہ منورہ میں قیام کے دوران آپؒ نے خورد سالی میں ان سے بھی کچھ درس لیا ہو۔ اس تفصیل کا کوئی پتہ نہیں چلتا کہ آپ نے حدیث شریف کی باقی کتب اور تفسیر و فقہ و اصول فقہ، نحو و صرف، منطق و فلسفہ کی کتب کن اساتذہ سے پڑھیں۔ البتہ یہ پتہ ضرور چلتا ہے کہ ۲۳ برس کی عمر تک یعنی ۱۲۹۵ھ تک آپ تحصیل علوم میں مشغول رہے۔ اور اس کے بعد درس تدریس میں دلچسپی لینے لگے ۱۳۰۶ھ مطابق ۱۸۸۸ء میں آپ معہ متعلقین ہندوستان واپس تشریف لائے اور یہاں بھی درس و تدریس کا شغل اختیار کیا۔ ذوقِ سخن وراثت میں پایا تھا جب آنکھ کھولی تو اپنے والد بزرگوار کو شعر و شاعری کی طرف متوجہ پایا تھا۔ وہی جذبۂ شعر و ادب آپ کے دل میں بھی موجزن تھا۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ آپ کو استاد

بھی مولانا حبیب الرحمٰن جیسے یگانۂ روزگار، مشفق و مہربان ملے۔ جن کی جامعیّت مسلّم تھی۔ قرائت، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول، بلاغت، ادب، صرف و نحو اور تصوف میں کامل دستگاہ رکھنے کے علاوہ علم عروض اور شعر و سخن میں اعلیٰ استادانہ صلاحیتوں کے حامل۔ بس پھر کیا تھا استادِ کامل کی توجہ اور چشمِ عنایت سے جذبات کا سمندر اشعار کی صورت میں اُبل پڑا۔ آپ نے عربی، فارسی اور اردو تینوں زبانوں میں اشعار کہے کیوں کہ آپ کو تینوں زبانوں پر یکساں عبور و مقدرت حاصل تھی۔ نمونہ کے طور پر آپ کا کچھ اردو کلام ذیل میں درج ہے۔ زبان و بیان نہایت شستہ، لطیف اکثر الفاظ کے حسب موقع استعمال اور بندش کی چستی سے اس امر کا صاف اظہار ہوتا ہے کہ اردو زبان و ادب کے فروغ کی جدوجہد بھی آپ کا مطمحِ نظر رہا۔ آپ نے غزلیات بھی کہیں مخمس بھی، تاریخی قطعات بھی کہے اور شجرے بھی نظم کیے۔ اس کے علاوہ آپ کی تحریریں، ملفوظات و مکتوبات، وعظ، پند و نصائح وغیرہ بھی بہت ہیں جو نہایت دلچسپ اور سبق آموز ہیں۔

اردو نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

دَستِ وحشت نے کیا چاک گریباں دل کا اب کچھ احباب نہیں کرتے ہیں درماں دل کا
کھینچتا ہے تو عبث تیغِ نگہ کو ظالم کر چکی فیصلہ یاں توصفِ مژگاں دل کا
دیکھ سودا نہ کر اس آفتِ جاں سے اے خیرؔ
سود کیسا نہ زیاں ہو کبھی ناداں دل کا

وہ ماہِ لقا خیرؔ کو کیونکہ نہ ملے گا اُس کا نہیں تو غیر کا کیا گھر نہ ملے گا
تیرا سا دلِ سخت ستمگر نہ ملے گا اے سنگ دل ایسا کوئی پتھر نہ ملے گا
امیدِ اثر نالہ و فریاد میں کیسی جُز رنج تجھے اے دلِ مضطر نہ ملے گا
پامال خرامِ بُتِ بدمست کو اے خیرؔ
آرام تہِ خاک بھی دم بھر نہ ملے گا

سحابِ لطفِ حق ہے سایہ گستر میرے گلشن پر
یہ برقِ طور ہے گرتی ہے جو میرے نشیمن پر
فروغِ حسنِ سیرت چاہیئے صورت سے کیا حاصل
نظر اہلِ حقیقت کی نہیں آرائشِ تن پر
ہوا ہیں زندۂ جاوید اسی کے دم سے اے قاتل
بڑا احساں تری تلوار کا ہے میری گردن پر
طلبگار اُس کے کیا نظروں میں لائیں دین و دنیا کو
فدا ہے دونوں عالم کا جمال اس گل کے جوبن پر
تجھے ناصح غرض کیا ہاتھ میرے پیرہن میرا
کسی کا زور چلتا ہے ہمارے جیب و دامن پر
ہوا اللہ اکبر خیرؔ مدفوں کوئے جاناں میں
بجا ہے خضر کو بھی رشک کرنا ایسے مدفن پر

زلف چہرے سے اٹھا اے مہ کامل قاتل
مرتے دم تو ہو نظارہ ترا حاصل قاتل
نہیں آتا کبھی بھولے سے بھی الفت کا خیال
سخت پتھر سے زیادہ ہے ترا دل قاتل
دم بہ دم جوشِ جنوں اور ترقی پر ہے
رنگ لائی ہے عجب قیدِ سلاسل قاتل
کیوں نہ ہو گور مری غیرتِ فردوسِ بریں
میرا اے خیرؔ ہے اک حورِ شمائل قاتل

مصوّرِ فطرت حضرت خواجہ حسن نظامی دہلویؒ

آپ حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ کے خاندان کے صوفی منش بزرگ تھے جو ۱۲۹۰ھ میں دہلی میں پیدا ہوئے۔ صوفیانہ ماحول میں پرورش پائی درویشوں اور صوفیوں کے حلقہ بگوش رہے۔ ہوش کی دنیا میں قدم رکھتے ہی علم و دین و تصوّف کے حصول میں مصروف ہو گئے۔ فطرتاً ذہین اور خداداد صلاحیتوں کے حامل تھے۔ پھر تحصیل علم و تصوّف کا جذبہ پہلے ہی دل کے سمندر میں موجزن تھا جو آپ کو آباو اجداد سے ترکہ میں ملا تھا۔ آناً فاناً علم کی منزلیں طے کر گئے۔ آپ کا رجحان طبع درس و تدریس کے علاوہ تصنیف و تالیف کی طرف بہت زیادہ مائل تھا۔ بچپن سے ہی اخبارات و رسائل کے لیے مضامین لکھنے کا شوق تھا جو اکثر و بیشتر اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے تھے۔ یہی آپ کی زندگی کا دلچسپ مشغلہ بن گیا تھا۔ عبادت و ریاضت کے بعد آپ کا زیادہ تر وقت تصنیف و تالیف ہی کے کاموں پر صرف ہوتا تھا۔ آپ بہت منکسر المزاج، خلیق، درد دوز، انسانیت پسند اور متواضع قسم کے واقع ہوئے تھے، نہایت سادہ وضع قطع کے حامل تھے۔ نمائش اور تصنع سے سخت نفرت کرتے تھے۔ درویشوں، عالموں، صوفیوں کے قدر دان تھے۔ بدایوں کے باشندوں سے بالخصوص نہایت خلوص سے پیش آتے تھے انھیں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے شاید یہ خصوصیت اور امتیاز اس لیے ہو کہ حضرت محبوب الٰہی کی

جائے ولادت بدایوں کی سرزمین ہے۔

خواجہ صاحب نے اردو زبان وادب کی ترویج وترقی کے لیے بہت کام کیا آپ نے اپنی ذہانت وکوشش سے اردو زبان اور اس کے اندازِ بیان میں جو بناؤ سنگار، دلکشی اور خوبیاں پیدا کیں اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ آپ کے طرزِ تحریر کی یہ خصوصیت بھی ہے کہ آپ کی عبارت نہایت سلیس، سادہ عام فہم اور موثر و بامحاورہ ہے۔ اردو زبان وادب کو آپ نے اپنی تحریروں کے ذریعے ایک مخصوص ڈھنگ نیا اسلوب اور جدید موڑ دیا، جسے اردو ادب کی تاریخ میں کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ آپ نے قرآن شریف کا ترجمہ بھی کیا جو نہایت سلیس اردو میں ہے اور بہت مقبول ہے۔ آپ نے صوفی ازم اور تبلیغ دین کے فروغ کے لیے پندرہ روزہ اور ماہنامہ رسالے بھی ”منادی“ اور ”درویش“ جاری کیے جن کے ذریعہ صوفی ازم اور زبان وادب کے فروغ دونوں مقاصد میں خاطر خواہ کامیابی اور فروغ حاصل ہوا۔ مذکورہ رسائل میں آپ کا ”روزنامچہ“ مستقل شائع ہوتا تھا جو عوام کے لیے نہایت اہمیت کا حامل ہوتا تھا۔ اندازِ بیان اور زبان ایسی پیاری کہ اہل مطالعہ کو ہمہ تن اپنی طرف متوجہ کرلے۔

مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی مرحوم ومغفور اپنے ایک مضمون میں خواجہ صاحب کے اندازِ تحریر اور زبان وبیان کے تعلق سے یوں رقم طراز ہیں، ملاحظہ ہو:

> ”کوئی سلیس، عام فہم، بے تکلف، دہلی کا روزمرہ اور بول چال سننا چاہے تو حضرت حسن نظامی کی زبان سے سنے، کوئی میٹھی، سریلی، سجیلی، البیلی اردو کی بہار دیکھنا چاہے تو وہ دہلی والے خواجہ کے قلم کے تراشے ہوئے گل بوٹے، نقش ونگار دیکھ کر اُن پر اپنا سر دُھنے، بانکپن، شگفتگی اور ندرتِ بیان ان کا خاص ہنر ہے اور اثر، درد وگداز ان کے قلم کا امتیازی جوہر۔ جب چاہیں روتے بسورتے ہوؤں کو ہنسا دیں اور جب چاہیں ہنستے کھکھلاتے ہوؤں کو رُلا دیں۔ بچوں کو طرح

طرح کے کھلونے دے کر بہلاتے ہیں، جوانوں کا خون گرماتے ہیں اور بوڑھوں کو تسکینِ قلب کی نیند سلاتے ہیں، تصویر کشی میں یہ کمال کہ جس مضمون پر قلم اٹھائیں قال کو حال بنا دیں، حرف کے پیکرِ بے جان کو جاندار بنا کر دکھا دیں شنید کو دید کا جامہ پہنا دیں، عنوان آتشبازی ہاتھ آئے تو جیسے خود پھلجھڑی چھٹنے کا تماشہ دکھا دیں۔ اور صاحب بڑی بات یہ کہ لکھتے لکھاتے جو کچھ بھی ہیں، سب بس اپنی خداداد ذہانت سے اپنی جبلّی جدّت طبع کے کس بل پر۔ نہ اُنھوں نے کسی کا رنگ اڑایا اور نہ کسی کے چراغ سے اپنا چراغ جلایا۔ ان کے معاصر ایک سے ایک ادیب اور انشا پرداز، سحر طراز لیکن خواجہ صاحب اپنی انفرادیت میں سب سے ممتاز اُن کا رنگ اگلوں اور پچھلوں سب سے نرالا، یہ نہ کسی کے شاگرد نہ کسی کے مقلّد اور ادب و انشا کو اگر ایک قسم فقہ کی قرار دیا جائے تو یہ پکّے غیر مقلّد۔

یہ بندوں کا ذکر اور اُن سے خطاب جس طرح کرتے ہیں اس کا نمونہ کلام کی بسم اللہ کے طور پر سب سے پہلے یہ ملاحظہ ہو کہ یہ اپنے مالک و مولا سے راز و نیاز کس انداز کا رکھتے ہیں۔ اپنی ایک کتاب "آپ بیتی" کی تمہید اس مناجاتی لب و لہجہ میں اُٹھاتے ہیں۔

"یا اللہ! میری مدد کر، تو مراد ہے، ہم مرید ہیں، تو حقیقت ہے، ہم مجاز ہیں۔ تو جڑ ہے، ہم شاخیں ہیں۔ تو نور السموات والارض ہے ہم تیری شعاعیں ہیں۔ ظاہر میں میرا ہاتھ تیرے بندوں کو مرید کرتا ہے، اور ان کی بیعت لیتا ہے مگر باطن میں تیرا ہی ہاتھ ہمارے ہاتھوں پر ہے اور تو ہی ہمارے ہاتھوں پر اپنا ہاتھ رکھ کر بیعت قبول کرتا ہے۔ پس مجھکو توفیق دے کہ اپنے ہاتھ پر مرید ہونے والوں کو اپنے وجود سے کمتر نہ سمجھوں نہ اپنی ذات کو پیر و مرشد خیال کروں بلکہ تجھ کو مراد اور پیر تصور کر کے اپنے مریدوں کو تیرا مرید اور اپنا پیر بھائی جانوں۔"

خواجہ صاحب کی تحریر کی یہ خصوصیت تھی کہ وہ صاف بے تکلف، چھوٹے چھوٹے سادہ جملے استعمال فرماتے تھے۔ ان کی تحریر میں نہ پیچیدہ ترکیبیں ہوتی تھیں نہ ثقیل الفاظ نہ ادق عبارت۔

خواجہ صاحب نے اردو زبان و ادب کی بے پناہ خدمات انجام دی ہیں جنھیں بھلایا نہیں جا سکتا۔ کئی فارسی کتب کے سلیس اردو میں ترجمے بھی کیے ہیں اس ضمن میں ان کی عملی سرگرمیوں اور اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے لیے ان کے دلی جذبات و احساسات کا اندازہ خود ان کے ایک نوٹ سے ہی لگایا جا سکتا ہے جو انھوں نے رسالہ "منادی" دہلی ماہ اکتوبر ۱۹۴۶ء کے باب "اردو گلستان" میں زیر عنوان "حضرت شیخ سعدیؒ کی گلستاں کا اردو ترجمہ" لکھے مضمون میں اپنے قلم سے تحریر فرمایا ہے۔ نوٹ مذکور ملاحظہ ہو۔

> "بعد حمد و صلوٰۃ کے حسن نظامی دہلوی عرض کرتا ہے کہ آج کل ہندوستان میں فارسی زبان کا چرچا بہت کم ہو گیا ہے اور فارسی جاننے والے سو میں دو چار آدمی بھی بہت مشکل سے ملتے ہیں اور جو ہیں وہ بھی چراغ سحری ہیں۔ کیونکہ انگریزی اور اردو کا رواج بڑھ گیا ہے اور عربی فارسی کا رواج گھٹ گیا ہے۔ اس واسطے میں نے ارادہ کیا ہے کہ پرانے بزرگوں کی فارسی کتابوں کا عام فہم ترجمہ شائع کیا جائے کہ بزرگوں کے فارسی الفاظ بھی موجود رہیں" تاکہ قدامت کی برکت قائم رہے اور موجودہ زمانے کے لوگوں کو بزرگوں کی اخلاقی اور روحانی اور سیاسی اور مجلسی نصیحتوں اور تجربوں سے فائدہ پہنچ سکے۔"

اس نوٹ کے بعد خواجہ صاحب نے اپنا تمہیدی مضمون شروع کیا ہے اور اس کے بعد شیخ سعدیؒ کے مختصر احوال زندگی، حسب نسب وغیرہ کے بعد اپنے مضمون کے آخر میں "ترک دیباچہ" کے عنوان سے ایک اور نوٹ لکھا ہے جس سے ان کے اپنے مقصد، عزم و عمل اور طریقۂ کار پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ اہلِ مطالعہ کی معلومات

کے لیے یہ نوٹ بھی ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

ترک دیباجہ

" چونکہ میرا اصلی مقصد گلستاں کی فارسی عبارت کو عنوانوں کے ذریعہ موجودہ زمانے کے لیے پسندیدہ بنانا ہے اور پھر گلستاں کے آٹھویں بابوں کا اردو ترجمہ کرنا ہے اس واسطے میں حضرت شیخ سعدیؒ کے اس دیباچے کو شریک کرنا ضروری نہیں سمجھتا جو گلستاں کے شروع میں ہے اور جس میں حضرت شیخ سعدیؒ نے بہت فصاحت و بلاغت کے ساتھ حمد و نعت لکھی ہے اور اپنے وقت کے بادشاہ زادے کا ذکر کیا ہے جس کے نام کی مناسبت سے حضرت شیخؒ نے اپنا تخلص سعدی رکھا تھا اس بادشاہ زادے کا نام سعدی بن ابی بکر بن سعد تھا۔

میں اپنے کاموں کو جہاں تک ہو سکتا ہے اختصار کے ساتھ ختم کرنا چاہتا ہوں اور موت کی آوازیں سن سن کر پیچھے مڑ مڑ کر دیکھتا ہوں اور ہنس کر فرشتۂ اجل سے کہتا ہوں بھائی صاحب! گھبراتے کیوں ہو۔ کچھ دیر ٹھہر جاؤ۔ پان کھاؤ حقّہ پیئو۔ تھک گئے ہو تو کچھ دیر آرام کر لو۔ یا سینما کا کوئی فلم دیکھنے چلے جاؤ میں ابھی تھوڑی دیر میں شیخ سعدیؒ کی گلستاں کا ترجمہ پورا کر کے تمہارے ساتھ چلنے کو تیار ہو جاؤں گا۔

گویا میں ان تصنیفات کو جو اس وقت میرے قلم کے ایوان کی مہمان ہیں مختصر کھانے کھلانے چاہتا ہوں۔ کیونکہ انگریزوں نے ہندوستان میں غذا و لباس کو راشن بندی کا قیدی بنا دیا ہے۔

آج کل پانچ کتابیں مسلسل تصنیف و تالیف کر رہا ہوں۔ اردو گلستاں چھٹی کتاب ہے اور پانچ کتابوں کے آٹھ آٹھ صفحے ماہوار رسالے منادی دہلی میں اس غرض سے شائع کر رہا ہوں کہ مجھے لکھنے میں آسانی ہو اور پڑھنے والوں کو پڑھنے میں آسانی ہو اور پھوئیاں

پھوئیاں تالاب بھر جائے یعنی ایک سال کے بارہ پرچوں میں پانچوں کتابیں پوری ہو جائیں۔ اس واسطے میں نے ہر کتاب کے لکھنے اور ترجمہ کرنے میں وقت کی بچت کا خیال رکھا ہے۔ اور بزرگوں کی کتابوں میں جو چیزیں زمانے والوں کے لیے زیادہ مفید اور ضروری سمجھیں انھیں کو لیا ہے زائد چیزوں کو چھوڑ دیا ہے۔ چنانچہ "تاریخ جہادِ رسولؐ" اور "تاریخ اولیا" اور "تاریخ اسلامی ہند" وغیرہ سب کتابوں میں یہی اصول نظر آئے گا اور اہل علم جو مذکورہ کتابوں کی طوالت سے واقف ہیں وہ میری مختصر نویسی کی وجہ کو سمجھ لیں گے۔

حسن نظامی دہلوی

حجرہ درگاہ دہلی ۲۵ اکتوبر ۱۹۴۶ء

خواجہ صاحب نے ادبی، مذہبی تبلیغی تاریخی وغیرہ ہر قسم کی کتب بڑی تعداد میں اردو میں تصنیف و تالیف فرمائیں۔ اپنی حیات کا بہت بڑا حصہ اسی خدمت پر صرف کیا۔

درج ذیل مطبوعات خواجہ صاحب کی بے مثال تصانیف و تالیف ہیں۔ نہیں کہا جا سکتا کہ عصر حاضر میں ان کتب میں سے کون کون سی دستیاب ہیں اور کون کون سی نایید۔

تاریخی کتب :-

"میلاد نامہ"، "محرم نامہ"، "یزید نامہ"، "تاریخ سلاطین عباسیہ"، "طمانچہ برخسار یزید"، "تاریخ سلاطین دکن"، "تاریخ مسیح"، "کرشن بیتی"، "گیارھویں نامہ"، "آپ بیتی"، "جگ بیتی"، "روزنامہ سفر حجاز و شام"، "سفر نامہ ہندوستان"، "روزنامچہ ۱۹۲۴ء"، "سیر دہلی کی معلومات"، "دہلی میں غدر"، "آنسوؤں کی بوندیں"، "انگریزوں کی بپتا"، "محاصرہ غدر کے خطوط"، "بہادر شاہ کا مقدمہ"، "غدر دہلی کے گرفتار شدہ خطوط"، "غدر دہلی کے اخبار"، "غالب کا روزنامہ"، "دہلی کی جانکنی"، "دہلی کا آخری سانس"، "غدر کی صبح و شام"۔

خواتین کے لیے :

”بیوی کی تعلیم“۔ ”بیوی کی تربیت“۔ ”اولاد کی شادی“۔

بچوں کے لیے :

”قرآن آسان قاعدہ“۔ ”تعلیم القرآن“۔ ”اردو سبق“۔ ”مسلمان بچوں کے دس سبق“۔ ”بچوں کی کہانیاں“۔ ”رسول کی عیدی“۔

متفرق کتب :

”خدائی انکم ٹیکس کلاں“۔ ”اردو دعائیں“۔ ”مرشد کو سجدۂ تعظیم“۔ ”اولاد کے کانوں میں کہنے کی باتیں“۔ ”تسکین احساس“۔ ”درویشی مولود شریف“۔ ”بچوں پر ستم“۔ ”چوتھی صدی کے تین شہید“۔ ”چار درویشوں کا تذکرہ“۔ ”فلسفۂ شہادت“۔ ”لے دور کا سلام“۔ ”اسلام کا انجام“۔ ”اسرار“۔ ”شیخ سنوسی“ ”جرمنی خلافت“۔ ”گاندھی نامہ“۔ ”امام الزماں کی آمد“۔ ”سی پارۂ دل“۔ ”چٹکیاں اور گدگدیاں“۔ ”اتالیق خطوط نویسی“۔ ”شیطان کا طوطا“۔ ”طریقت کی چار کتابیں“۔ ”نظم المعراج“۔ ”نظم الہام“۔ ”تمباکو نامہ“۔ ”مجالس حسنہ“۔

تبلیغی کتب :

”فاطمی دعوت اسلام“۔ ”عام فہم تفسیر قرآن“۔ ”روزے کے مسائل“۔ ”نمازوں کا بیان“۔ ”اسلام کے عقائد“۔ ”اسلامی رسول“۔ ”اسلامی توحید“۔ ”قرآن مجید کی بارہ خوبیاں“۔ ”معجزات قرآنی“۔ ”قرآن مجید کے دیوانی و فوجداری قوانین“۔ ”ہندو مذہب کی معلومات“۔ ”حلال خور“۔ ”غزنوی جہاد“ ”ہندوستان میں اسلام“۔ ”محمد بن قاسم“۔ ”داعئ اسلام“۔ ”شراب اور جوئے کی خرابیاں“۔ ”پرندوں کی تجارت“۔ ”حلوائی کی تعلیم“۔ ”بنواڑی کی دکان“ ”ترغیب حساب“۔ ”قبروں کے عینی نوشتے“۔

ان کے علاوہ بھی خواجہ صاحب نے اور بہت سی کتب چھوٹی بڑی تصنیف اور تالیف کیں جو زندگی کے ہر شعبہ سے متعلق اصلاح کی ضامن قرار پاتی ہیں۔ یہ بات بار بار

دہرانی پڑتی ہے کہ خواجہ صاحب نے اردو زبان وادب کی خدمت کے لیے اپنی زندگی وقف کر دی تھی۔ اگرچہ وہ اب ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کی تحریری یادگاریں ہمیشہ ہمیشہ ہمارے دلوں میں ان کی یاد تازہ رکھیں گی۔ اور آنے والی نسلیں اُن کی گرانقدر تصانیف وتالیفات سے سبق حاصل کرتی رہیں گی۔

خواجہ صاحب نے تحریری طور پر تصنیف وتالیف کے ذریعہ تو اردو زبان اورادب کی نمایاں خدمات انجام دی ہی ہیں لیکن اس کے علاوہ زبانی وتقریری طور پر بھی آپ نے اردو کی ترویج وترقی میں قابل ذکر کردار ادا کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ زبانی وتقریری سرگرمیوں کے پس پردہ ان کے دیگر مقاصد تبلیغ وتصوّف کے فروغ سے متعلق وابستہ رہے ہوں، تاہم یہ ماننا پڑے گا کہ ان کی تقریری اورزبانی سرگرمیوں کے نتیجہ میں بھی اردو کے فروغ کو کافی سہارا اور تعاون ملا۔ ۱۹۱۱ء میں انھوں نے "حلقۂ مشائخ" کے نام سے ایک تحریک قائم کی جس کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ تمام ایشیا کے داعیانِ معرفت کو ایک مرکز پر جمع کیا جائے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے انھوں نے مصر، فلسطین، شام، حجاز وغیرہ کا طویل سفر بھی اختیار کیا اور اپنی سخت کوشش اور سرگرم جدوجہد سے تبریز، بسطام، اصفہان۔ موصل۔ بصرہ، القطیف۔ حلب، دمشق، عدن اور انطاکیہ وغیرہ میں "حلقۂ مشائخ" کی شاخیں بھی قائم کیں۔ ہندوستان کے مختلف صوبوں کا سفر کیا اور ہر صوبہ میں نظامی تبلیغ کے ادارے قائم کیے۔ ہر قریہ، قصبہ اور ہر شہر میں تبلیغی حلقے اور دینی تبلیغی مدرسے قائم کیے۔ نظامی تبلیغ کے اراکین وداعیان گاؤں گاؤں پھر کر تحریک کے پروگرام اور خواجہ صاحب کی ہدایت کے بموجب تقریریں کرتے اور عام فہم سادہ زبان میں اپنے نیک مقاصد لوگوں کے سامنے بیان کرتے۔ تبلیغی کتابیں تقسیم کرتے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس عمل کے نتیجہ میں بھی اُردو زبان وادب کے فروغ میں کافی تعاون ملا۔ ظاہر ہے کہ ان سب تحریکوں اور پروگراموں کی بانی خواجہ صاحب ہی کی ذات گرامی تھی اس لیے اس طریقہ سے بھی اردو کی

ترقی و فروغ کا سہرا خواجہ صاحب ہی کے سر رہتا ہے۔ غرض ان تمام حالات و واقعات سے یہ حقیقت روز روشن کی طرح واضح اور نمایاں ہوجاتی ہے اور قارئین کو یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری نہیں ہوسکتی کہ حضرت خواجہ حسن نظامی صاحب نے اردو زبان و ادب کی کس قدر خدمت انجام دی۔ ۳۱ر جولائی ۱۹۵۵ء کو خواجہ صاحب نے داعیِ اجل کو لبیک کہا اور اس طرح دلّی کی روایتی وضعداری اور شائستگی کی آخری نشانی کی یہ شمع ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگئی۔

الحاج حافظ سحبان الہند

حضرت مولانا احمد سعید دہلویؒ

سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلوی رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ ۱۸۸۳ء کو دہلی کے ایک دیندار، خدا پرست اور معزز خاندان میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد کا اسم گرامی حافظ نواب مرزا تھا جو نہایت متقی و پرہیزگار اور خدا پرست انسان تھے۔ حضرت مولانا احمد سعیدؒ ابھی اپنی عمر رواں کی پچیسویں منزل ہی میں گامزن تھے کہ ۱۹۰۸ء میں ان کے والد بزرگوار مرزا صاحب نے داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

مولانا احمد سعید صاحب نے ابتدائی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی تھی اور اس کے بعد متواتر کئی عربی مدارس میں وقت کے معروف و مستند علماءِ کرام سے درس حاصل کیا۔ آخر میں علوم دینی کی تکمیل حضرت مفتی اعظم مولانا مفتی کفایت اللہ رحمتہ اللہ تعالیٰ علیہ سے کی اور فارغ التحصیل ہوئے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ نے آپ کو بے شمار دینی و دنیاوی خوبیوں سے نوازا تھا۔ آپ حافظ قرآنِ پاک بھی تھے، عالم و فاضل بھی، مفسّر قرآن بھی اور اسرارِ قرآنی کے رازداں بھی تھے، ادیب و شاعر بھی تھے اور بے مثل خطیب بھی۔ حج بیت اللہ شریف کی سعادت عظمیٰ سے کئی بار مشرف ہوئے۔ نہایت متقی اور صوفی منش انسان تھے۔ چشتیہ خاندان سے بیعت تھے۔ ارباب تصوّف کے بے حد قدر دان، مشائخ طریقت کے ارادتمند اہل فقر سے دلی محبت رکھتے تھے۔ خود کو فقیر لکھنے میں ایک روحانی مسرت اور فخر محسوس کرتے تھے

تبلیغ دین اور بلا امتیاز مخلوق خدا کی بے لوث خدمت اور ہر ایک کے دکھ درد میں کام آنا آپ کی زندگی کا بہترین و دلچسپ مشغلہ اور فطرت تھی۔ مولانا صاحب نسبت بزرگ تھے وہ سالک بھی تھے اور مجذوب بھی مگر جذب کی کیفیت کو اپنے قابو میں رکھتے تھے۔ جب اولیاء اللہ کے مزارات پر حاضری دیتے تو وہاں سے واپسی کے وقت آپ کے چہرے کے نقش و نگار و تاثرات اور کیفیت دیکھنے اور محسوس کرنے کی چیز ہوتی تھی۔ وہ اپنی اشک ریز آنکھوں کو ایک بڑے رومال سے، جو ہمہ وقت ان کے سر سے بندھا رہتا یا شانے پر پڑا رہتا تھا، بار بار پونچھتے، آواز میں رقت پیدا ہو جاتی جیب میں کچھ ہوتا تو نذرانہ بکس میں ڈالتے اور پھر باہر آکر غرباء و مساکین میں تقسیم کرتے۔

مولاناؒ کے دل میں ملک و ملت کا درد اور خدمت کا بے پناہ جذبہ تھا وہ بیک وقت دو محاذوں کے مجاہد تھے۔ جنگ آزادیِ وطن کے نڈر سپاہی بھی اور ملک و ملت کی تعمیر و اصلاح کے معمار و رضاکار بھی۔ لیکن ان کی سیاسی زندگی بھی مذہب اور علم و ادب کے تابع رہی انھوں نے کبھی دانستہ کوئی ایسا اقدام و عمل نہیں کیا جو مذہب، علم و ادب اور اخلاق کی اقدار کے منافی ہو۔ آپ کا ہر اقدام و عمل ملک و ملت کی بھلائی و بہبودی کی نیت پر مبنی ہوتا تھا۔

۱۹۲۰ء میں جمعیۃ العلماء ہند کے قیام کے بعد مولانا موصوف اس کے ناظم اعلیٰ مقرر ہوئے۔ تحریک خلافت میں ۱۹۲۱ء میں اسیر زنداں کیے گئے اور آخری بار ۱۹۴۰ء میں گرفتاری عمل میں آئی۔ اس درمیانی مدت میں جس قدر بھی قومی، وطنی اور ملی تحریکیں وجود میں آئیں آپ نے قریب قریب ان سب میں نمایاں طور پر حصہ لیا۔ ۱۹۲۱ء سے ۱۵؍ اگست ۱۹۴۷ء تک جنگ آزادی کے دوران کئی بار قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں۔ ۱۹۴۰ء تک جمعیۃ العلماء ہند کے ناظم اعلیٰ رہے اور اس کے بعد آل انڈیا جمعیۃ العلماء کے نائب صدر اور صوبہ دلی کے صدر رہے۔ ۱۹۵۷ء میں حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی وفات کے بعد آپ جمعیۃ العلماء ہند کے صدر اعلیٰ منتخب ہوئے۔

ان تمام قومی و وطنی، ملّی و علمی، ادبی و دینی اور سیاسی مشاغل و مصروفیات کے باوجود آپ ہمہ وقت رطب اللسان رہتے تھے۔ یعنی ذکر و درود شریف کی تسبیح برابر جاری رہتی تھی اور آپ کی توجہ دینی خدمات اور علمی و ادبی امور کی جانب بھی برابر مبذول رہتی تھی۔ مولانا کی گرانقدر تصانیف میں جو کم و بیش بیس بائیس کتب پر مشتمل ہیں "خدا کی باتیں"۔ "رسول کی باتیں"۔ "پردے کی باتیں"۔ "جنت کی کنجی"۔ "دوزخ کا کھٹکا" "شوکت آرا بیگم"۔ "تقریر سیرت" وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو اپنی افادیت، انداز بیان و زبان سلاست و دلچسپی اور دیگر خوبیوں کی بنا پر مقبول خاص و عام ہیں۔ یہ ایسی سبق آموز اور دلچسپ اور مردوں عورتوں بچوں اور جوانوں سب کے لیے یکساں مفید اور قابل مطالعہ تصانیف ہیں جن سے اہل ذوق اور ارباب ادب ہمیشہ استفادہ حاصل کرتے رہیں گے۔ ان کے علاوہ مولانا موصوف کا سب سے اہم اور عظیم کارنامہ آپ کی عام فہم تفسیر کلام پاک ہے جو نہایت سادہ، سلیس اور عام فہم زبان میں ہے۔ مولانا نے اپنے نیک مقاصد کی تکمیل اور زبان و ادب کے فروغ کے لیے "موتمر المصنفین" کے نام سے ایک ادارہ بھی قائم کیا ہوا تھا جس کے روح رواں آپ خود تھے اور اپنی تصانیف کی نشر و اشاعت کے لیے اپنے خلف اکبر مولانا حافظ محمد سعید صاحب کی زیر نگرانی اردو بازار جامع مسجد دہلی میں "دینی بکڈپو" بھی قائم کرا دیا تھا۔ جو اب تک قائم ہے۔

حضرت مولانا احمد سعیدؒ کی سیرت اور اُن کی زبان دانی کے مختلف اور متعدد پہلو ہیں خطابت، صحافت، سیاست، معاشرت، ادب و انشا۔ شعر و سخن، علمی وسیع النظری، اخلاق و عادات، علوم دینیہ، تصوف، خدمت و شفقت، ایثار و ہمت، جذب و کیف، باطنی رجحانات اور ان کے علمی ادبی ذخیرے میں وہ سب کچھ مل سکتا ہے جس کی خواہش اور ضرورت ہو مگر انتخاب اور سلیقہ کا انتخاب بہت وقت چاہتا ہے۔ فرصت اور فارغ البالی چاہتا ہے اور محنت چاہتا ہے۔ یہ کام بالخصوص مولانا مرحوم و مغفورؒ کے موجودہ متعلقین و لواحقین اور بالعموم نئی نسل کا ہے کہ وہ ان کے عظیم علمی ادبی

ذخیرے میں سے اُن جواہر ریزوں کو چنیں اور مختلف عنوانات کے تحت ترتیب دے کر ملک میں موجود اور آنے والی نئی نسل کو مولانا کی عظیم علمی ادبی، دینی خدمات اور ان کی زندگی سے روشناس کرائیں۔

نثر نگاری کے اعتبار سے مولانا موصوف کی بات ایک سند کا درجہ رکھتی تھی، موقع محل کی مناسبت اور مخاطب کے فہم وشعور کے مطابق نہایت نپی تلی بات کہتے تھے۔ وقت اور ماحول کے تقاضوں کا خیال رکھتے ہوئے اپنے دل کی بات نہایت دلچسپ اور لطیف انداز میں ادا کرتے تھے. دلی کی ٹکسالی زبان کے ماہر بلکہ مالک تھے. آپ نکتہ داں نازک خیال شاعر بھی تھے اگرچہ کم کہتے تھے مگر سوچ سمجھ کر سبق آموز اور کام کی بات کہتے تھے۔ اسیرؔ تخلّص فرماتے تھے. آپ کا کوئی مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا تاہم آپ کے خاندانی افراد اور ہم عصر مصاحبوں اور جلیسوں سے آپ کے کچھ اشعار ضرور سنے جاتے ہیں۔ بطور نمونہ چند اشعار درج ذیل ہیں جو مولانا موصوف نے حضرت خواجہ میر دردؔ دہلوی کی مشہور غزل کے وزن اور قافیہ ردیف میں کہے ہیں۔ حضرت دردؔ کا مصرع ہے ؎

"تہمتیں چند اپنے ذمہ دھر چلے"

مولانا فرماتے ہیں ؎

لوگ جب میّت مری لے کر چلے
میرے ارماں بن کے نوحہ گر چلے
تیرے صدقے اے شہ لطف وکرم
ہاتھ خالی آئے داماں بھر چلے
ایسے آنے سے نہ آنا خوب تھا
شام آئے شب سے پہلے گھر چلے

(حضرت مولانا احمد سعید اسیرؔ دہلوی)

دھلی کے مشائخ کی ادبی خدمات

مصنفہ:
بیگم ریحانہ فاروقی

اردو اکادمی
دھلی